نام کتاب:	محدثین عظامؒ اوران کے علمی کارنامے
مؤلف:	مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
کتابت:	مشتاق احمد غازیپوری، صلاح الدین ندوی
اشاعت نو:	بائیس سو(۲۲۰۰)
باہتمام:	مرکز الشیخ أبی الحسن الندوی
سن طباعت:	۲۰۱۰ء
صفحات:	۳۳۵
قیمت:	۱۵۰/روپئے
ناشر:	جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

ملنے کے پتے:

۱۔ جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ یوپی 9450876465

۲۔ نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند 01336-223294

۳۔ ندوی بک ڈپو، لکھنؤ 9935797969

فہرست مضامین محدثین عظام

امام اعظم ابوحنیفہؒ

امام مالکؒ

امام شافعیؒ

امام احمد بن حنبلؒ

امام بخاریؒ

امام مسلمؒ

امام ابوداودؒ

امام ترمذیؒ

امام نسائیؒ

امام ابن ماجہؒ

امام طحاویؒ

أعلام المحدثين
و مآثرهم العلميّة

تبصرہ نگار: فضیلت مآب شیخ محمد بن ناصر عبودی

(اسسٹنٹ جنرل سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

ترجمہ: از: پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد ندوی

پیش نظر نئی کتاب درحقیقت اردو زبان میں لکھی گئی کتاب ''محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے'' کا نیا عربی روپ ہے، جسے مولانا سید جاوید احمد ندوی صاحب نے پوری محنت و جانفشانی سے ترجمہ کر کے مؤلف کتاب کی خدمت میں پیش کیا، مؤلف نے جو عربوں کی طرح عربی بولتے ہیں، اسے پڑھا اور بہت کچھ اضافہ کیا، پھر زبان و بیان کو اس قدر سنوارا کہ اب یہ کتاب ایسی ہوگئی کہ جیسے مؤلف نے اس کو اصلاً عربی ہی میں لکھا ہو، ترجمہ کی اسی خوبی و خوش اسلوبی اور مؤلف کی پسندیدگی کی بنا پر ہم نے اس کتاب کو نئی کتاب کے درجے میں شمار کیا۔

''**أعلام المحدثين و مآثرهم العلميّة**'' (محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے) جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے، حدیث نبوی شریف کی روایت، درایت، تاریخ اور تقریظ میں ہمہ تن مشغول رہنے والے اہم محدثین اور ان کے کارناموں کے علمی جائزے اور فنی گفتگو پر مشتمل ہے، جن میں از راہِ مثال ''صحیح بخاری'' ہے جسے ''**الجامع الصحيح للإمام البخاري**'' کہا جاتا ہے، یا ''صحیح مسلم''، جسے ''صحیح بخاری'' کے ہم مثل سمجھا جاتا ہے اور دونوں کو ملا کر ''صحیحین'' کہا جاتا

ہے اور یہی دو کتابیں حدیث نبوی شریف کے میدان میں سب سے زیادہ صحیح اور معتبر گردانی جاتی ہیں، قدمائے محدثین میں اس بات پر اختلاف بھی رہا کہ ان دونوں میں افضل کون سی ہے، بعدازاں مکمل اتفاق یا تقریباً اتفاق ہو گیا کہ ''صحیح بخاری'' کا درجہ بلحاظ صحت، ''صحیح مسلم'' سے افضل ہے، کسی نے منظوم شکل میں یہ کہا کہ ''بخاری'' و ''مسلم'' کی فوقیت کے سلسلے میں کچھ لوگ تنازع کے شکار تھے تو میں نے کہا کہ ''بخاری'' بلحاظ صحت اسی طرح فائق ہے جس طرح ''مسلم'' بلحاظ حُسنِ ترتیب سب پر فائق ہے''۔

تَنَازَعَ قَوْمٌ فِي البخاريِّ ومسلمٍ لَدَيّ وقالوا أيّ ذينِ يقدّم

فقلت: لقد فاق البخاريّ صحةً كما فاق في حُسن الصناعة مسلم

کتاب کے مقدمے: یہ کتاب ایک بھرپور اور مفصل مقدمہ سے مزین ہے جو عالم گیر داعی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے، ہندوستان کے دینی مدارس کے علماء اور طلبہ عموماً اسی مدرسے کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں جس سے وہ فارغ ہوتے ہیں، اس سے ان کا مقصد اپنے مدرسے کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، عرب ممالک کے لوگ جب مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کو'' ندوی'' کے لقب سے متصف دیکھتے یا سنتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے، لیکن صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ ایک دینی مدرسہ ''ندوۃ العلماء'' جو ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں واقع ہے اس سے فارغ التحصیل ہونے کی تعلیمی و دینی نسبت مختلف لوگوں کو وابستہ رکھتی ہے۔

کتاب کا آغاز بعنوان'' عربی طباعت کا مقدمہ'' سے ہوتا ہے، جسے خود مؤلف کتاب ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے لکھا ہے جس سے ہماری بات کی تائید ہوتی

ہے کہ انہوں نے عربی ترجمہ پر نظر ثانی بھی کی اور حسبِ ضرورت ترمیمات کے ساتھ مزید اضافے بھی کیے۔

پھر علم حدیث میں مؤلف کے استاذ جلیل، محدث کبیر شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ کا ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد بعض علمائے کرام کے قلم سے کتاب اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف اور توصیفی کلمات ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنے نو (۹) صفحات پر مشتمل مقدمہ میں حمد وثنا اور صلوٰۃ وسلام کے بعد رقم طراز ہیں:

''میرے لیے یہ دوگونہ سعادت ومسرت کا موقع ہے کہ عزیز گرامی مولوی تقی الدین صاحب ندوی کی قابل قدر تصنیف ''محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے'' پر بطور پیش لفظ وتعارف کے چند سطریں لکھوں، دوگونہ سعادت ومسرت اس لیے کہ یہ تصنیف ایک پاکیزہ مقصد کے ماتحت اور ایک نہایت اہم موضوع پر ہے جس کی حوصلہ افزائی، قدرشناسی اور اشاعت وتبلیغ، دین کے ہر اس خادم کے لیے جس کی زمانے کے فتنوں پر نظر ہے، موجب سعادت اور ذخیرۂ آخرت ہے، ثانیاً اس لیے کہ مصنف عزیز کا تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بہت گہرا ہے، وہ اس درسگاہ کے فاضل بھی ہیں اور وہیں حدیث کے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں، **بارک اللہ في علمه وشكر مساعيه**''۔

مولاناؒ مزید فرماتے ہیں کہ:

''ہمارے قدیم اساتذہ ومدرسینِ حدیث کوان مستشرقانہ اعتراضات وتشکیکات کی بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات اورفنی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصروشام اور ہندوستان وپاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام اور محدثین کے کارناموں کو علمی وتحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔

اس زریں سلسلۂ تصنیف میں دو کتابیں خاص طور پر امتیاز رکھتی ہیں، ایک شام کے مشہور عالم استاذ مصطفیٰ السباعی مرحوم (متخصص جامع ازہر وسابق عمید کلیۃ الشریعہ جامعہ دمشق) کی کتاب ''السنۃ ومکانتھا في التشریع الإسلامي ''ہے، جواپنے موضوع پر (میری کوتاہ نظر اور محدود علم میں) سب سے زیادہ جامع ومؤثر کتاب ہے اور جس نے اہل علم ودین کے حلقے میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے، دوسری فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (متوفی ۱۳۷۵ھ) کی اردو تصنیف ''تدوین حدیث''ہے، (جس کا عربی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے)''۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے طویل مقدمہ پر ہی کتاب کا مقدمہ ختم نہیں ہوگیا بلکہ اس کے بعد مقدمہ طبعِ اول کے نام سے مؤلف کا بھی ایک مقدمہ ہے، جس کا عنوان ہے ''حدیث وسنت کی تعریف سے متعلق تمہیدی باتیں''، اس کے بعد اسلامی شریعت میں سنتِ رسولؐ کے عنوان سے گفتگو آگے بڑھتی ہے۔

صفحہ ۱۵؍ پر مؤلف نے ''عام تاریخی ذخیروں سے حدیث نبوی شریف کا امتیاز'' کے عنوان سے ابوحاتم محدث کے حوالے سے واضح کیا ہے کہ ابتدائے آفرینش سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اس روئے زمین پر کوئی قوم، امتِ مسلمہ سے زیادہ اپنے نبیؐ کے آثار کو محفوظ رکھنے والی پیدا نہیں ہوئی، بعدازاں کتاب کے اصل ابواب شروع ہوتے ہیں، پہلا باب: ''صحابۂ کرامؓ کی تحصیل سنت کی کیفیت'' کے عنوان سے ہے۔

صفحہ ۲۰؍ پر ''طلب حدیث کے لیے صحابہؓ کی رحلت'' کا عنوان کچھ نامانوس سا ہے، کیوں کہ اہل علم اور طلبہ کے ذہن پر یہ بات چڑھی ہوئی ہے کہ صحابۂ کرامؓ آنحضرت ﷺ سے احادیث براہ راست حاصل کرتے تھے، صحابہؓ کے بعد سلف صالحین خصوصاً عبدالرزاق صنعانی، زہری، امام احمد اور امام بخاری جیسے محدثین بھی بڑی تعداد میں معتبر راویوں سے طلب حدیث کے لیے سفر فرماتے تھے۔

بعدازاں کتاب میں صفحہ ۳۵ پر ایک انتہائی اہم عنوان ہے ''وفاتِ رسالت مآب ﷺ کے بعد حدیث کے سلسلے میں صحابۂ کرامؓ کا موقف''، اور اس موضوع پر مفصل گفتگو ہے۔

''خبر آحاد اور اس کا درجہ'' کے عنوان سے بھی بہت اچھی بحث کتاب میں موجود ہے، اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض حقائق کی ایک جھلک صفحہ ۲۷، ۲۸ سے پیشِ خدمت ہے:

> ''اصطلاح میں خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں جو متواتر نہ ہو، اگر تواتر کا عدد کسی طبقے میں پورا نہ ہو تو اس کو خبر واحد ہی کہا جائے گا، خواہ وہ کتنے

ہی افراد سے روایت کی گئی ہو، حضور ﷺ وصحابۂ کرامؓ نے اس کو قابلِ اعتماد سمجھا ہے اور ہر زمانے کے علماء وفقہاء نے واجب العمل قرار دیا ہے ، امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف ''الرسالہ'' میں بہت سی آیات و احادیث سے ثابت کیا ہے کہ اخبارِ آحاد قابلِ اعتماد اور واجب العمل ہیں۔

حضور ﷺ نے مختلف جگہوں پر لوگوں کو دعوت وتبلیغ کے لیے بھیجا تھا، اس میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں فرمایا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خبر واحد حجت شرعی ہے، اگر چہ اس کے اندر خطا کا امکان عقلی موجود ہے، مگر عقل وفطرت انسانی کے نزدیک اس قسم کے احتمالِ عقلی کا کوئی اعتبار نہیں اور عرفاً اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔

معتزلہ وغیرہ جو اخبار آحاد کی افادیت کے منکر ہیں، ان پر شیخ الاسلام علامہ بزدویؒ کی بات پورے طور سے صادق آتی ہے: **من أنكر العلم بطريق الخبر أصلا، فهذا رجل سفيه لم يعرف نفسه ولا دينه ولا دنياه ولا أمه ولا أباه،** (اصول البزدوی ج۲ص۳۶۲) جس نے خبر واحد کا انکار کیا وہ دراصل ایک بیوقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو، نہ دنیا کو، نہ اپنی ماں کو، نہ اپنے باپ کو۔

محدثین نے اخبار آحاد کے متعلق جو یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ قرائن نہ ہوں تو ظن کا فائدہ دیتی ہے جس طرح خبر متواتر یقین

کا فائدہ دیتی ہے، مگر وہ ظن جس کا فائدہ اخبار آحاد دیتی ہے وہ یقین سے زیادہ قریب ہے، محدثین نے اس کو ظنی ''اصطلاحی معنی'' میں قرآنیات کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے ، کہاں وہ ظنی اصطلاحی اور کہاں یہ بول چال والا گمان جو شک وشبہ اور بے اعتباری کے موقع پر بولا جاتا ہے، دونوں کو ایک درجہ کی چیز سمجھنا نہایت ہی جہالت ہے، جیسے کوئی قیاس کو محض اٹکل کے معنی میں لے کر قیاس منطقی کی جو استدلال کی مستقل شکل ہے، ہنسی اڑانے لگے، یہ تمسخر فنِ منطق پر نہ ہوگا بلکہ اپنی بے علمی پر ہوگا، اگر خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے تو بہت سے دنیاوی معاملات معطل ہو کر رہ جائیں گے''۔

کتاب میں بعض دیگر مباحث بھی قابل ذکر ہیں، مثلاً:

☆ عہد رسالت میں کتابت حدیث

☆ کتابت حدیث سے متعلق صحابۂ کرامؓ کا موقف

☆ عہد نبویؐ کے تحریری سرمایہ پر ایک نظر

ائمہ اربعہ: مذکورہ بالا مباحث کے بعد مؤلف نے ان احادیث پر توجہ کی ہے جن کا تعلق فروعات میں رائج مسالک والے ائمہ اربعہ سے ہے اور جو ''تدوین حدیث میں ائمہ اربعہ کا کردار'' کے عنوان سے زیر بحث ہے، ائمہ اربعہ: امام ابوحنیفہ جنہیں بعض لوگ امام اعظم کہتے ہیں، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس شافعی اور امام احمد بن حنبل۔

ائمہ حدیث اور حدیث میں ان کے مراتب پر کتاب میں صفحہ ۶۳ سے

۱۳۴ تک نسبتاً زیادہ تفصیلی مباحث ہیں، اس کے بعد اکابر محدثین پر گفتگو ہے، ابتدا بجا طور پر امام بخاریؒ سے ہے، کیوں کہ کتابِ الٰہی کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب کی تالیف کا کارنامہ انہیں کے بدست انجام پایا اور سنت محمدیؐ کو بالعموم چھان پھٹک اور انتخاب و تفقہ کی راہ سے دنیا میں متعارف کرایا اور روایت و درایت کا بے نظیر نمونہ پیش کیا۔

امام بخاریؒ اور ان کی صحیح سے متعلق مؤلف نے معتبر معلومات پر مبنی منفرد بحث اور لب لباب پیش کیا اور دیگر علماء کے افکار سے مزین کیا ہے جو ۱۳۵ سے ۱۷۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے بعد امام مسلم اور ان کی صحیح پر سیر حاصل گفتگو ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے پھر اصحاب سنن اور ان کی کتابوں پر گفتگو ہے جس کی ابتدا امام ابوداود سے کی گئی ہے، انتہا امام ابن ماجہ پر ہے، جب کہ امام نسائی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ اس کتاب میں مثلث کی شکل میں نظر آتا ہے۔

اصحاب سنن کے بعد امام طحاوی پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، ان کا نام، نسب، وطن، طلب حدیث کی راہ میں سفر اور ان کی تالیفات خصوصاً ''معانی الآثار'' پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے، آخر میں فہارس ہیں۔

۳۳۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت قیمتی اور مفید ہے اور ایسے موضوع کا اِحیاء کرتی ہے جو سچ مچ اسی طرح کے اِحیاء اور گہرائی و گیرائی کا متقاضی تھا اور جس کا تعلق حدیث رسول ﷺ، تدوین سنت اور اس کے دفاع سے ہے۔

محمد بن ناصر العبودی

أعلام المحدثين ومآثرهم العلميّة

پر رسالہ ''معارف''اعظم گڑھ کا تبصرہ

ائمہ اربعہ، محدثین صحاح ستہ اور امام طحاوی کے حالات اور ان کی محدثانہ شان وخدمات پر قریب پینتالیس سال پہلے زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف نے ''محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے'' کے نام سے ایک کتاب سپرد قلم کی تھی، اس وقت معارف میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''لائق مصنف کوفن حدیث سے خاص مناسبت ہے''انہوں نے خاص طور پر اس کتاب کے مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ ''اس میں حدیث کی اہمیت وحجیت اوراس کے ضبط وتحفظ میں اہتمام واحتیاط کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور منکرین حدیث کے اعتراضات کے شافی جوابات دیئے گئے ہیں'' زبان وبیان کی سلاست اور شگفتگی اور تحقیق میں محنت وجستجو کی داد بھی دی گئی تھی، کتاب کوان خوبیوں کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، قاضی اطہر مبارک پوری، ماہر القادری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی جیسے صاحب نظر علماء وادباء نے بھی اس کی بڑی تحسین کی، یہ فاضل مصنف کی پہلی تصنیف تھی لیکن موضوع کی برکت نے ان کی آئندہ زندگی کے لیے خدمت حدیث کواس طرح متعین کردیا کہ آج پینتالیس سال کے بعد وہ ''بذل المجھود فی حل سنن أبي داود''،

’’أوجز المسالک شرح موطأ مالک‘‘، ’’التعلیق الممجد‘‘ شرح الموطأ بروایت امام محمد اور ’’ظفر الأمانی‘‘ جیسی عظیم الشان کتابوں کے محقق ومدون کی حیثیت سے عالم اسلام میں ایک ممتاز محدثانہ شان وشناخت کے حامل ہیں، ہندستان کے محدثین اور دوسرے اور حدیثی عنوانات سے ان کی کتابیں عالم عرب سے شائع ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان سب کا سرآغاز کتاب ’’محدثین عظام‘‘ ہی ہے جس کے مقدمے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے لکھا تھا کہ ’’مصنف ندوی ومظاہری خصوصیات کے جامع ہیں‘‘ یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ ’’ابھی تو وہ جواں سال عالم اور صحیح معنی میں دشت علم وتحقیق کے مسافر ہیں، ان کی عمر ومطالعہ کے ساتھ ان کی معلومات، علم ونظر کی وسعت اور تصنیف وتحریر کی پختگی ترقی کرے گی‘‘ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی، محدثین عظام کے کئی ایڈیشن نکلے، عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہوئی، فارسی زبان میں ترجمہ ہوا اور اب زیر نظر کتاب کی شکل میں اس کا بہت خوب صورت عربی ترجمہ بھی آ گیا ہے، ترجمہ بھی اصل کتاب کی طرح سلیس ہے، ترجمہ کی خوش اسلوبی کی داد فاضل مصنف نے بھی اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے دی ہے، اردو کی طرح اس عربی قالب کی مقبولیت بھی یقینی ہے۔

مولانا عمیر الصدیق ندوی
رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

اکابر علماء کی آراء

''محدثین عظام'' کے پہلے اڈیشن پر ملک و بیرون ملک کے اکابر علماء اور مجلّات وجرائد نے مؤلف کی جو حوصلہ افزائی فرمائی، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے اور مفتی محمود صاحب نے رنگون سے خطوط کے ذریعہ اظہار مسرت فرمایا، بالاختصار چند اکابر کی آراء کو نقل کیا جارہا ہے۔

''حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی رائے گرامی''

۞ کتاب اپنی جامعیت اور اپنی افادیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے، اس میں حجیتِ حدیث اور جدید فتنۂ انکار حدیث وتضحیکِ حدیث کے جوابات بھی پوری طرح آگئے ہیں اور معروف ومشہور ائمہ حدیث کے علاوہ چاروں ائمہ فقہ اور امام طحاوی کی بھی خدمات کا بیان خاصی تفصیل سے آگیا ہے۔

مصنف بہ یک وقت ندوی بھی ہیں اور مظاہری بھی، اور ان کی اس دوگانہ حیثیت کی شاہدِ عدل ان کی یہ کتاب ہے، مظاہری تحقیق فن اور ندوی سلاست ومتانت بیان، کتاب عالموں اور عامیوں دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوگی، اور ہر دینی درسگاہ اور انگریزی کالج کے طلبہ کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ہے۔

صدق جدید ۲۳/ستمبر ۱۹۶۷ء

۞ ''مؤلف اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں''۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ''برہان''

۞ ''پوری کتاب علمی و دینی معلومات کا خزانہ ہے اور مغز ہی مغز ہے، مؤلف کی یہ پہلی علمی و تصنیفی کاوش پتہ دیتی ہے کہ وہ درس وتدریس کی مشغولیت میں بھی اس طرح کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں''۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ''انقلاب''

۞ ''یہ کتاب مؤلف نے بڑی محنت وجستجو سے لکھی ہے زبان وبیان سلیس اور شگفتہ ہے''۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی ''معارف''

۞ ''جس ضرورت کے پیش نظر فاضل مؤلف نے یہ کتاب مرتب کی ہے اس کے لیے یہ مجموعہ یقیناً کارآمد ومفید ہے''۔ ''رسالہ زندگی''

۞ ''مولانا تقی الدین صاحب ندوی اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں، انہوں نے جرح کے مقابلہ میں تعدیل کی راہ اختیار فرمائی ہے، ائمہ حدیث پر جو اعتراضات وارد ہوئے ہیں ان کو رفع کیا ہے یا اس کی قابل قبول توجیہ وتاویل فرمائی ہے، کتاب بڑی محنت، دیدہ ریزی اور دینی شغف کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، زبان وبیان میں سادگی پائی جاتی ہے''۔

''رسالہ فاران کراچی''

۞ ''یہ تالیف اہل علم کے لیے خصوصاً اور اہل ذوق کے لیے عام طور پر مفید اور نفع بخش ثابت ہوگی''۔

''رسالہ دارالعلوم دیوبند''

حضرة الأستاذ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا[۱] صاحب مدفیوضہم کی رائے گرامی

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

عزیز محترم الحاج مولوی تقی الدین صاحب ندوی مدرس حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے متفرق علمی مضامین جو وقتاً فوقتاً رسائل میں شائع ہوتے رہے، اکثر سنتا رہا، ان کی کتاب ''محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے'' کے مضامین جو بعض رسائل میں شائع ہوئے ہیں، کبھی کبھی سنے اور معلوم ہوا کہ یہ سب مضامین کتابی صورت میں شائع ہورہے ہیں، اس سے بہت مسرت ہوئی، یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے، اللہ جل شانہ ان مضامین سے اہل علم کو زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے اور مولانا موصوف کے لیے دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، مولانا موصوف کے علوم وفیوض سے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے اور کتاب کو اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائے، اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین کی عادت نہیں، لیکن دعا سے دریغ نہیں، دل سے دعا کرتا ہوں۔ فقط

(حضرت شیخ الحدیث) محمد زکریا

مظاہرالعلوم سہارنپور، ۸؍جمادی الأولی ۱۳۸۶ھ

۱۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب نوراللہ مرقدہٗ یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴؍مئی ۱۹۸۲ء کو مدینہ منورہ میں دارآخرت کی طرف رحلت فرماگئے، ۸۷؍سال کی عمر تھی جنت البقیع جواررسول ﷺ میں تدفین عمل میں آئی، إنا لله وإنا إليه راجعون۔

عرض حال

کتاب کا پانچواں ایڈیشن

آج سے سینتالیس سال پہلے اس ناچیز کے قلم سے سب سے پہلی کتاب ''محدثین عظام'' نکلی، بحمد اللہ بہت مقبول بھی ہوئی، ہند و پاک میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ مگر اِدھر عرصہ سے یہ کتاب ختم ہو چکی ہے، ضرورت تھی کہ یہ ناچیز اس پر دوبارہ نظر ڈال لے اور اضافے یا استدراک کے بعد اس کو شائع کیا جائے لیکن تالیفی وتدریسی کام اس طرح بڑھتے چلے گئے کہ اس کا موقعہ نہ نکل سکا۔

آج سے پچیس سال پہلے ۱۹۸۴ء میں اس ناچیز نے اپنے لڑکے ڈاکٹر ولی الدین ندوی سلمہ کو جامعہ ازہر میں داخلہ کی غرض سے قاہرہ کا سفر کیا، وہاں پر ڈاکٹر عبد المنعم النجم جو بعد میں رئیس قسم الحدیث بھی ہو گئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتلایا کہ میں نے اپنے ''P.H.D.'' کے رسالے بعنوان ''**الإمام أبو داود ومنهجه في السنن**'' کے سلسلے میں آپ کی کتاب ''محدثین عظام'' منگوایا اور اس کے بعض حصوں کو ترجمہ کرا کے سنا، اور اپنے رسالہ میں اس سے استفادہ کیا، میں نے بھی خود ان کے رسالہ کو دیکھا کہ چار جگہوں پر ''محدثین عظام'' کا حوالہ ہے، اس سے

بے حد مسرت ہوئی، اس کے بعد اس کتاب کو عربی [۱] میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اللہ کرے کہ اس کی توفیق نصیب ہو۔

اگر چہ صحاح ستہ اور امام طحاوی پر مفصل مقالات عربی میں مختلف مجلّات علمیہ میں عرب ممالک میں شائع ہو چکے ہیں اور کتاب "الإمام البخاري" و"الإمام أبو داود" و"الإمام مالك" کتابی صورت میں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں، خاص طور سے "الإمام البخاري" میرے علم کے مطابق اس کے بیس ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

بہر حال آج کل تھوڑا سا وقت نکال کر ''محدثین عظام'' پر نظر ثانی کا کام شروع کیا، اور بہت غور سے پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ معمولی فروگذاشت اور ضروری بعض اضافے کے بعد کتاب کو اسی حجم میں رکھا جائے، اس لیے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر مختصر اور جامع ہے، کتاب کا حجم مطلوب نہیں جیسا کہ دیگر علماء کی آراء جو شروع کتاب میں نقل کی گئی ہیں اس سے ظاہر ہے۔

یہ نیا اڈیشن مرکز الشیخ أبي الحسن الندوی کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے، اس پر نظر ثانی کرتے وقت اضافہ بھی کیا گیا ہے، اللہ تعالی اس کتاب کو قبول فرمائے

---

[۱] اس کا عربی زبان میں ترجمہ عزیز گرامی مولانا سید جاوید احمد ندوی نے کیا ہے اور عربی ایڈیشن میں کافی اضافہ کیا گیا ہے جو بیروت سے "**أعلام المحدثين ومآثرهم العلمية**" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس پر عرب علماء نے اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے، خاص طور سے رابطۂ عالم اسلامی کے نائب جنرل سکریٹری شیخ محمد بن ناصر العبودی نے، انہوں نے کتاب پڑھ کر اس پر تقریظ کی ہے جو بعض عربی رسالوں میں شائع ہوئی، اور اس کا اردو ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد ندوی صاحب کے قلم سے شروع کتاب میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (تقی الدین ندوی)

اور اس میں تعاون کرنے والوں خاص طور پر عزیز گرامی مولانا محمد نسیم الدین ندوی مدرس جامعہ اسلامیہ کو دنیا و آخرت میں بہترین جزائے خیر عطاء فرمائے۔

فقط

تقی الدین ندوی

جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ

۲۸ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ، ۹ جولائی ۱۹۹۴ء

بروز جمعہ بعد نماز عصر

نوٹ: کتاب کے اس پانچویں جدید ایڈیشن میں اضافہ بھی کیا گیا ہے اور اغلاط کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

مقدمہ

از

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

أَمَّا بَعْدُ! میرے لیے یہ دوگونہ سعادت ومسرت کا موقع ہے کہ عزیز گرامی مولوی تقی الدین صاحب ندوی کی قابل قدر تصنیف ''محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے'' پر بطور پیش لفظ وتعارف کے چند سطریں لکھوں، دوگونہ سعادت ومسرت اس لیے کہ یہ تصنیف ایک پاکیزہ مقصد کے ماتحت اور ایک نہایت اہم موضوع پر ہے، جس کی حوصلہ افزائی، قدرشناسی اور اشاعت وتبلیغ، دین کے ہر اس خادم کے لیے جس کی زمانہ کے فتنوں پر نظر ہے، موجب سعادت اور ذخیرۂ آخرت ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ مصنف عزیز کا تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بہت گہرا ہے، وہ اس درسگاہ کے فاضل بھی ہیں اور وہیں حدیث کے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے

ہیں [1]، بارک الله في علمه وشکر مساعیه.

یورپ کے مستشرقین اوران کے مشرقی تلامذہ ومقلدین کی ذہانت، اورحسن انتخاب کی داد نہ دینا ظلم ہے کہ انھوں نے عالم اسلامی میں ذہنی انتشار تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بےعملی، تعطّل، اخلاقی انارکی اور شک وارتیاب پیدا کرنے کے لیے حدیث وسنت کا انتخاب کیا اوراس کی حجیت، حفاظت، تاریخیت پر ایک منظّم حملہ کیا اور اس پورے شعبہ اور جدید اصطلاح کے مطابق اس پورے ادارہ ''انسٹی ٹیوشن'' (INSTITUTION) کو علمی وتاریخی حیثیت سے نہایت مشکوک ومشتبہ اور کمزور وبے بنیاد عمارت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

انھوں نے کبھی روایات کی اس تعداد پر جو محدثین کے حالات وتذکروں میں لکھی جاتی ہے، اپنی سخت حیرت واستعجاب کا اظہار کیا اوراس کو خلافِ فطرت بتایا، کبھی محدثین کے حافظہ کے واقعات کو خلاف عقل وقیاس ٹھہرایا، کبھی فاروق اعظمؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کے استفسارات اور انتظامات کی روایات کا سہارا لے کر مکثرین صحابہؓ۔ حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ- کی کثرتِ روایات میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی، کبھی حدیث کی ترتیب وتدوین کو پچھلے دَور اور تیسری چوتھی صدی کی کوششیں بتا کر روایتِ حدیث کے تسلسل اوراس کی تاریخیت کو مجروح قرار دیا، کبھی سیاسی واعتقادی محرکات وعوامل کو نمایا کر کے حدیث کے ایک بڑے ذخیرہ کو سیاسی وکلامی مصالح کی بناء پر موضوع قرار دینے کی کوشش کی، کبھی وضع حدیث کو قصوں کے آب وتاب کے ساتھ نقل کر کے سارے سرمایۂ حدیث کو مشتبہ قرار دینے کی سعی کی، کبھی تدوین حدیث

---

[1] مؤلف اس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھا۔

کو مذاہب اربعہ کے اثبات واحقاق کا تابع وخادم ثابت کر کے احادیث کی نقل وروایت کو فقہی گروہوں اور مکاتب خیال کے تقابل وکشمکش کا نتیجہ ثابت کرنا چاہا۔

واقعہ یہ ہے کہ فِرَقِ باطلہ اور اسلام کے خلاف سازشوں کی تاریخ میں اگر اس ذہانت کی کوئی نظیر مل سکتی ہے تو صرف غُلاۃ روافض کی تاریخ میں جنھوں نے صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت کو مجروح کر کے قرآن مجید کے نقل وتواتر ہی کو مشکوک بنادیا، اوران سے بہت سے غالیوں نے قرآن مجید ہی کی تحریف اوراس میں کمی زیادتی کا دعوی کیا، اوراس کو اپنے مذہب کا شعار بنالیا۔

مستشرقین کی چابک دستی، مستعدی، اکثر مغربی حکومتوں کی حوصلہ افزائی وسرپرستی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی صحیح ذہنی تربیت سے محرومی، یورپ سے مرعوبیت اور نظام تعلیم کے غلط اثرات کی بناء پر، نیز موجودہ دور کے عمل گریز، انتشار پسند اور مغرب پرست رجحان کی مدد سے یہ فتنہ ان ممالک میں خاص طور پر اثر انداز ہوا جنھوں نے ابھی حال میں یورپ کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے، لیکن علمی وذہنی غلامی میں وہ پہلے سے زیادہ مبتلا ہوگئے، یا جنھوں نے سیاسی وعلمی ترقی وتنظیم کے راستہ پر نیا نیا قدم اٹھایا ہے ان میں بدقسمتی سے سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان خاص طور پر قابل ذکر ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہمارے قدیم اساتذہ ومدرسینِ حدیث کو ان مستشرقانہ اعتراضات وتشکیکات کی بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات اور فنی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصروشام اور ہندوستان وپاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام، اور محدثین کے کارناموں کو علمی وتحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ

شروع ہوگیا ہے۔

اس زریں سلسلۂ تصنیف میں دو کتابیں خاص طور پر امتیاز رکھتی ہیں، ایک شام کے مشہور عالم استاذ مصطفے السباعی مرحوم (متخصص جامع از ہر و سابق عمید کلیۃ الشرعیہ جامعہ دمشق) کی کتاب ''السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي'' ہے، جو اپنے موضوع پر- میری کوتاہ نظر اور محدود علم میں- سب سے زیادہ جامع ومؤثر کتاب ہے، اور جس نے اہل علم ودین کے حلقہ میں بھی بڑی مقبولیت حاصل کی ہے، دوسری فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی تصنیف ''تدوین حدیث''، جس میں مصنف نے اپنی عادت کے مطابق بڑا بیش قیمت مواد جمع کر دیا ہے، اور بعض بالکل نئے نظریات وتحقیقات پیش کئے ہیں، ان دو جلیل القدر کتابوں کے علاوہ متعدد چھوٹی بڑی کتابیں عربی اور اردو میں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

تقریباً تمام اعلی دینی مدارس میں- جن کو اصطلاحاً مدارس عربیہ کہا جاتا ہے، حدیث کے درس وتدریس کا بڑا اہتمام ہے، مصر وشام کے بڑے بڑے دینی مدارس اور جامعات کے برخلاف، جہاں اب صرف حدیث کے منتخبات پڑھانے کا دستور ہو گیا ہے، ہندوستان و پاکستان کے ان مدارس میں صحاح ستہ کی مکمل تدریس کا رواج ہے، خاص طور پر ''ترمذی'' و ''بخاری'' اور کسی حد تک ''ابو داود'' و ''مسلم'' بحث وتحقیق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، کہیں کہیں ''طحاوی'' اور ''موطأ'' کو بھی بحث وتحقیق کے ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن ان کتابوں کی ضخامت اور ان کی فقہی بحثوں کی مصروفیت کی وجہ سے بہت کم طلبہ وفضلاء فن حدیث کی تاریخ اصحاب صحاح کے حالات زندگی طبقاتِ کتبِ حدیث وخصوصیات کتب وغیرہ سے کما حقہ واقف ہو پاتے ہیں۔

حجیت حدیث اور اس پر جدید اعتراضات اور ان کے تشفی بخش جوابات کا مسئلہ تو اور بھی مشکل ہے، اگرچہ کتب حدیث کے بعض جدید شروح کے مقدمہ میں ان کے فاضل مؤلفین نے بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے، لیکن ہمارے عربی مدارس کے بہت سے مدرسین شاید معاصر ہونے کے قصور میں ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، مثلاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے بخاری کی زیر طبع شرح ''لامع الدراری'' کے مقدمہ میں، اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری نے اپنی ترمذی کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' کے مقدمہ میں بہت کارآمد مواد جمع کر دیا ہے، ضرورت تھی کہ کوئی ایسا فاضل مدرس، جن کو طلبہ کی ضرورت کا بھی احساس ہو، قدیم وجدید ذخیرہ پر بھی نظر ہو، اور جدید اعتراضات کی بھی خبر ہو، سلیقہ سے اس مواد کو ضروری حد تک جمع کر کے اردو میں پیش کر دیں، اور اس کو ایک ایسا مجموعہ بنا دیں جو تمام عربی مدارس کے طلبہ، نیز متوسط تعلیم یافتہ طبقہ، اور صاحب ذوق اردو داں حضرات کے لیے بھی مفید ودلچسپ ہو، اس سے ایک طرف ہمارے طلبہ وفضلاء کو فن حدیث کی تاریخ، اور کتب صحاح کے مصنفین کے حالات کا علم ہو، دوسری طرف ان تعلیم یافتہ اصحاب کو- جو عربی سے نا آشنا ہیں- علم حدیث کی ضرورت اور محدثین عظام کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ ہو، اور وہ ان کے علمی ودینی مساعی کا حال پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کر لیں، اور اپنی معلومات میں بھی اضافہ کریں۔

شکر ہے کہ اللہ تعالی نے ایک ندوی فاضل مولوی تقی الدین صاحب کو اس کی توفیق دی، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک خاصی مدت مستقل طور پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ صاحب کی خدمت میں قیام کیا،

حضرت موصوف کے درس حدیث میں بھی شرکت کی، جو اس عصر کا ایک ممتاز ترین درس حدیث ہے، اور ان کے مسودات وخصوصی تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا، اس طرح وہ ندوی ومظاہری خصوصیات کے جامع ہیں، اسی کے ساتھ وہ کئی سال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کی اونچی کتابوں کا درس دے رہے ہیں، قدیم مآخذ کے ساتھ عربی واردو کی جدید کتابوں پر بھی ان کی نظر ہے۔

اس طرح امید ہے کہ یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہوگی، اور نہ صرف ہمارے مدارس بلکہ دینی حلقہ کی بھی ایک ضرورت پوری کرے گی، کوئی انسانی کوشش بھی نقائص سے خالی نہیں، اور ابھی تو وہ جواں سال عالم، اور صحیح معنی میں دشت علم وتحقیق کے مسافر ہیں، ان کی عمر ومطالعہ کے ساتھ ان کی معلومات، علم، نظر کی وسعت، اور تصنیف وتحریر کی پختگی ترقی کرے گی، خدا ان کو علم ودین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے، ان کی اس پہلی کوشش وخدمت کو کامیاب بنائے اور قبول فرمائے، اور طلبائے مدارس واہل دین کو ان کی کوششوں سے نفع پہونچے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدي السبیل

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۶ء

حرف آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و نصلى على رسوله الكريم .

أما بعد! ناچیز مؤلف نے اپنے استاذ ومرشد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مد فیوضہم [۱] ''جن کی توجہ و برکت سے یہ کتاب پیش کی جارہی ہے'' کے درس بخاری کے افادات خصوصاً ابتداء درس میں امام بخاری کے حالات، ''جامع صحیح'' کی خصوصیات کی پر مغز و مدلل و مفصل تقریر کو نہایت اہتمام سے قلمبند کیا تھا، اس کے ساتھ استاذ محترم کا ایک بیش قیمت مقالہ جو امام ابوداؤدؒ اور ان کی ''سنن'' کی خصوصیات پر مشتمل ہے جو حقیقتاً ''بذل المجہود'' کے لیے لکھا گیا تھا، اس غیر مطبوعہ مقالہ کی نقل دیگر افادات کے ساتھ میرے پاس موجود ہے، ان کے علاوہ جن قدیم وجدید کتابوں سے میں نے اس کتاب میں استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست آخر میں دیدی ہے۔

آج سے کئی سال پیشتر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تدریس حدیث کی خدمت اس ناچیز کے ذمے کی، بالخصوص آج سے پانچ سال قبل جب پہلی مرتبہ ''جامع

---

[۱] اس عبارت کو لکھتے وقت حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہٗ باحیات تھے۔

ترمذی'' پڑھانے کا موقع ملا تو اس ضرورت کا شدید احساس ہوا کہ حدیث پڑھنے والے طلباء کے لیے ارباب صحاح ستہ وامام طحاوی کے حالات اوران کی کتابوں کی خصوصیات کو کتابی صورت میں جمع کر دیا جائے، اس مقصد کے تحت مقالات لکھنے کا آغاز کیا، چنانچہ اس کتاب کے اکثر مضامین رسالہ ''برہان'' اور ''معارف'' و''الفرقان'' میں شائع ہو چکے ہیں، جن کو اہل علم نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، موجودہ زمانے میں منکرین حدیث جو فی الواقع علم حدیث کی عظمت اور محدثین کے کارناموں سے ناآشنا ہیں، انھوں نے اس مقدس فن کو مشکوک ومشتبہ بنانے کی ناپاک کوشش کی اور کررہے ہیں، جس سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ناواقفیت کی بناء پر متاثر نظر آتا ہے، اس لیے حجیت حدیث، علم حدیث کی ابتدائی تاریخ اور ائمہ اربعہ کے حالات اوران کی خدمات حدیث کا ذکر ناگزیر معلوم ہوا، تاکہ عہد رسالت اور ارباب صحاح ستہ کے درمیانی عہد میں علم حدیث کی حفاظت وصیانت کا تسلسل بھی معلوم ہو جائے اور ائمہ اربعہ کی خدمات حدیث سے واقفیت بھی حاصل ہو جائے، اگر چہ اس کتاب کی تالیف میں ہمارے پیش نظر تمام عربی مدارس کے طلباء ہیں، مگر اس کے ساتھ ہم نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ ہمارے اردو تعلیم یافتہ طبقے کے لیے بھی یہ مجموعہ کارآمد ومفید ثابت ہو۔

اس کتاب کو بہت پہلے مکمل ہو جانا چاہیے تھا مگر اپنے طویل سلسلۂ علالت کی وجہ سے جو تقریباً دوسال سے قائم ہے، کتاب کی تکمیل میں تاخیر ہوئی اور مسودہ پر نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا مگر اب بفضلہٖ تعالیٰ افاقہ ہوا تو نظر ثانی کا کام بھی پورا کرلیا۔

میرے مخدوم ومربی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی توجہ وہمت افزائی بھی برابر میری معاون رہی، انھوں نے اس کتاب کے لیے ازراہ عنایت

وشفقت ایک قیمتی مقدمہ بھی تحریر فرمایا جو زینت کتاب ہے، اور یہ ناچیز تہ دل سے ممنون ہے۔

اسی طرح میرے ایک قدیم محبّ ومحسن (حاجی علاء الدین مرحوم جو بمبئی کے مشہور تاجر تھے) کی عنایت سے اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ بھی آسان ہو گیا، اللہ تعالی انھیں جزائے خیر دے۔

کتابت وطباعت کی تمام دشواریوں کو عزیزی مولوی محمد قمر علی ندوی مرحوم نے اپنے ذمہ لے لیا، ان کے علاوہ جن دوستوں وعزیزوں نے اس میں کسی نوع کا تعاون کیا ہے ان کا ممنون ہوں، اور دل سے دعا گو ہوں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کتاب کو شرف قبول عطا فرمائے اور دوام بخشے، اس ناچیز کی لغزشوں، کوتاہیوں کو اپنے فضل وکرم سے معاف فرما کر حضور اقدس ﷺ کی محبت واتباع نصیب فرمائے اور حدیث پاک کی خدمت کا مزید موقع عطا فرمائے، **وما ذلک علی الله بعزیز.**

فقط

تقی الدین ندوی مظاہری

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲/رجب یوم دوشنبہ ۱۳۸۶ھ

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی أما بعد.

حدیث کی تعریف آنحضرت ﷺ کو اس دنیا میں مبلغ و معلم بنا کر بھیجا گیا تھا، اور دین الٰہی کی آخری و مکمل کتاب قرآن مجید آپ کو عطا کی گئی تھی، اس مقدس کتاب کو آپ نے سنایا، سمجھایا، لکھوایا اور یاد کرایا، اور اس پر کامل طور سے عمل کر کے امت کو دکھایا، گویا آپ کی زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی، اس لیے حدیث کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو آپ کے سامنے پیش آئے اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں)، غرض پیغمبرؑ کے اقوال و افعال و تقریر کا نام حدیث ہے، بعض علماء نے صحابہ اور بعضوں نے ان کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال و افعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کرلیا ہے [۱]۔

دین میں حدیث وسنت کا مقام حدیث کا بڑا حصہ متواتر نہیں ہے، مگر امت میں بلاشبہ یہ عقیدہ متواتر رہا ہے کہ حدیث نبوی، قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے، پس اگر قرآن کی تشریعی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے بیان و شرح کی بھی تشریعی حیثیت ماننی پڑے گی۔

قرآن مجید اور احادیث پر جن علماء کی عمیق و وسیع نظر ہے، انھیں برملا معلوم ہے کہ احادیث صحیحہ تمام تر قرآن پاک کے کلی و عمومی احکام کے تحت مندرج ہیں،

---

[۱] ظفر الامانی ص ۳۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تشریح فرمائی ہے، امام شاطبی فرماتے ہیں کہ:

فكأنّ السنة بمنزلة التفسير والشـرح لـمعـاني أحكام الكتاب [۱].	سنت کتاب اللہ کے احکام کے معانی کے لیے تفسیر وشرح کا درجہ رکھتی ہے۔

امام شافعی نے اپنی تصنیف ''الرسالہ'' میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہے، دوسری وہ جو قرآن کے مجمل حکم کی تشریح ہے، تیسری وہ جس کا ذکر بظاہر قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے اور نہ اجمالاً، اس کے متعلق امام شافعی نے علماء کے چار نظریے نقل کئے ہیں [۲]، لیکن صحیح مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال بھی صحیفہ ربانی سے مستنبط ہیں، اس قسم کی حدیثوں کے مآخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز ادا اور اسلوب سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی لگا سکتے ہیں، قرآن مجید نہایت صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔

لقد من الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة. (آل عمران ۱۶۴)	بیشک اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں رسول انہیں میں سے جو پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

---

[۱] الموافقات جلد ۴ ص ۱۰ [۲] الرسالہ ص ۹۱، ۹۲

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن کی آیات کو پڑھ کر سنانا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم بھی آپ کے فرائض رسالت میں داخل ہے، جمہور ائمہ لغت وعلمائے قرآن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حکمت سے مراد قرآن کے علاوہ شریعت کے وہ احکام اور دین کے وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالی نے آپ کو مطلع فرمایا ہے، امام شافعی ''الرسالہ'' میں لکھتے ہیں:

سمعت من أرضیٰ من أهل العلم بالقرآن يقول: الحكمة سنة رسول الله ﷺ ۱؎.	میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنخضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں بہت سے علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

الصواب من القول عندنا في ''الحكمة'' أنها العلم بأحكام الله التي لا يدرك علمها إلا ببيان الرسول ﷺ والمعرفة بها، ومادل عليه ذلک من نظائره، وهو عندي مأخوذ من الحكم الذي بمعنى الفصل بين الباطل والحق ۲؎.	ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت احکام الٰہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول اللہ ﷺ کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتا ہے ان کی اور جو ان کی نظیریں ومثالیں ہیں، ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

۱؎ الرسالہ ص ۷۸ ۲؎ تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۵۵۷، ۵۵۸

معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد سنت کے ہیں، کیونکہ اس کا عطف کتاب پر ہو رہا ہے جو مغایرت کا مقتضی ہے، نیز اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کے ساتھ سنت کی اتباع بھی واجب ہے۔

سنن أبی داود میں مقدام بن معدیکربؓ سے روایت ہے۔

ألا إنّي أوتيت القرآن و مثله معه ۱؎.	سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مثل مزید برآں۔

ظاہر بات ہے کہ مثلہ معہ سے مراد سنت ہی ہے۔

اس حکمت کو کتاب اللہ کے ساتھ یاد رکھنے کا تاکیداً حکم بھی دیا گیا، فرمایا۔

واذکُرن ما یُتلیٰ ۲؎ فی بُیُوتِکن من آیات اللّٰہ و الحکمة. (احزاب آیت ۳۴)	اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کو یاد رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور احوال ہیں جس کے مجموعے کو حدیث یا سنت کہتے ہیں۔

قرآن مجید کے مجملات و مشکلات کی تفصیل اور عملی تشکیل آنحضرت ﷺ کے اقوال و اعمال اور آپ کے احوال جانے بغیر نہیں ہوسکتی، کیونکہ آپ مراد الٰہی کے مبین یعنی بیان کرنے والے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

۱؎ أخرجہ أبوداود فی سننہ (۱۹۷/۲/۴) رقم ۴۶۰۴

۲؎ لفظ یُتلیٰ سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لیے خاص ہے، کیوں کہ آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے، بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

وأنزلنا إليک الذكر لتُبين للناس ما نزل إليهم. (النحل آیت۴۴)

اورآپؐ پربھی ہم نے یہ یادداشت نازل کی تاکہ جوکچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے آپ اس کو کھول کر لوگوں سے بیان کردیں۔

قرآن مجید میں وضو،غسل،نماز،روزہ،زکوۃ،حج،درود،دعا،جہاد،ذکرالٰہی اسی طرح نکاح،طلاق،بیع وشراء،اخلاق ومعاشرت،سیاسیات ملت اورفصل قضایا وخصومات،غرض جملہ احکام دین کےمتعلق کلی احکام موجودہیں،اوران کواجمالاً بیان کیا گیاہے،مگران احکام کی تشریح اوران کے جزئیات کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نےفرمائی،اسی لیےآپ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالی کی اطاعت ہے،چنانچہ قرآن کریم میں صاف تصریح ہے۔

من يطع الرسول فقد أطاع الله. (النساءآیت۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ ہی کی اطاعت کی۔

آپ کی اطاعت اورسنت کااتباع جس طرح آپ کے دورسعیدمیں کیاجاتا تھا،اسی طرح آپ کے بعدبھی ضروری ہے،قرآن وحدیث میں اس کی بکثرت تاکید کی گئی ہے،حضورصلی اللہ علیہ وسلم کاارشادہے۔

تركت فيكم اثنين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله و سنتي. (جامع بیان العلم ج۲ص ۱۸۰ بحوالہ مستدرک ۱؍۹۳)

میں نےتم میں دوچیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کومضبوطی سے پکڑے رہو گے، گمراہ نہ ہوگے کتاب اللہ اورمیری سنت۔

عام تاریخی ذخیروں سے فن حدیث کے امتیازات | حدیث وہ مقدس فن ہے کہ اس کی اہمیت وخصوصیت کی وجہ سے اس کی حفاظت کے لیے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں وکروڑوں انسانوں کی کوششیں صرف ہوئی ہیں، حافظ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں کہ ''پہلی امتوں میں کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے رسول کے کلمات کو صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکتے، یہ صرف اس امت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق عطا ہوئی'' [۱]، اس عظیم کارنامے کا اعتراف غیروں کو بھی ہے، ڈاکٹر اسپنگر کہتا ہے کہ مسلمانوں نے علم حدیث کی حفاظت کے لیے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا، جس سے پانچ لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہو گئے [۲]۔

افسوس منکرین حدیث جو اس مقدس فن سے بالکل ناآشنا ہیں، تاریخ کی جھوٹی شہادتوں اور روایتوں کو تو قابل قبول سمجھتے ہیں، جس کے نہ راویوں کا پتہ ہے، نہ ان کے حالات زندگی معلوم ہیں، اور حدیث جس کی حفاظت کے لیے وہ سارے ذرائع استعمال کئے گئے جو کسی واقعے کی حفاظت کے لیے اس دنیا میں ممکن ہیں، اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ تاریخ کا روایتی سرمایہ اس دور شباب میں بھی چند مخطوطات ہیں، جو کہنہ الواح یا بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں دستیاب ہو گئے ہیں، یا وہ محفوظات ہیں جو محض سنی سنائی افواہوں پر بلاسند کے زیر ترتیب آ گئے ہیں، یہاں سند کا فقدان تاریخی واقعات کے ثبوت کے لیے کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا، اس پر نقد وتبصرہ صرف عقل کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اور انسانی دماغ ہی اس کو مرتبہ یقین تک پہونچاتا ہے [۳]، جیسا

---

[۱] الملل والنحل ج۲ص۲۲۱ [۲] خطبات مدراس بحوالہ مقدمہ اصابہ [۳] اسلامی تاریخ اس سے مستثنیٰ ہے۔

کہ علامہ شبلی نعمانیؒ کا بیان ہے، کہ کسی زمانے کے حالات قلم بند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کرلی جاتی ہیں، جن کے راویوں کے نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتے، ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں، جو قرائن وقیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑے زمانے کے بعد یہی ایک دلچسپ تاریخ بن جاتی ہے [1]، ان کمزوریوں کے باوجود دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، حدیث جس کی حفاظت وصیانت کے لیے ایسے قدرتی عوامل ہیں جو اس دنیا میں کسی تاریخی واقعہ کے لیے نہ میسر ہیں اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔

اب فن حدیث کے بعض امتیازات وخصوصیات کی طرف ہم مختصراً اشارہ کررہے ہیں جو اس کو دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں [2]۔

۱۔ عام تاریخی ذخیروں سے اس کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ تاریخ کے عام ذخیرے عموماً ایسے ہی ہیں کہ اس کا تعلق کسی قوم یا حکومت یا کسی عظیم الشان جنگ سے ہوتا ہے، بخلاف حدیث کے کہ اس کا تعلق براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے، ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے حالات بیان کرنے میں جس قدر غلطی کا امکان ہے، اسی قدر شخص واحد کی زندگی کے حالات بیان کرنے میں عقلاً صحت وواقعیت کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۲۔ دوسرا امتیاز جو پہلے سے اہم ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے، ان بزرگوں کو آپؐ سے وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہوتا ہے، اپنے باپ، ماں، عزیز واقارب، مال ودولت سب کچھ آپ پر قربان کرنے

---

[1] سیرۃ النبی ج اول ص ۲۶ [2] تدوین حدیث از مولانا گیلانی

کے لیے تیار تھے، یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مؤرخین کے ساتھ حاصل نہیں۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان چشم دید راویوں اور گواہوں یعنی صحابہ کرام نے بیعت ہی آپ کے دست مبارک پر اس لیے کی تھی کہ آپ کی حیات طیبہ کے ہر ہر جزء، ایک ایک خدوخال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔

وَ مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (الحشر۷)	رسولؐ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے اس سے رُک جاؤ۔

۴۔ اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کر لینا چاہئے کہ صرف حضورؐ کی اطاعت واتباع ہی ان بزرگوں کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ انھیں دعوت وتبلیغ کا حکم بھی دیا گیا تھا، قرآن کہتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (آل عمران۱۱۰)	تم ایک بہترین امت ہو، انسانوں کی بہی خواہی کے لیے ظاہر کئے گئے تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے روک دو۔

اس کی تفسیر مختلف انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے، منٰی کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے سب کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے۔:

نضر الله امرءاً سمع منا شيئاً فبلّغه كما سمع، فرُبّ مبلّغ أوعى من سامعٍ ۱؎.	تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی، پھر اس کو پہونچایا جس طرح سنا ہے، بعض بواسطہ سننے والے براہ راست سننے والے کے مقابلہ اُوعی یعنی اَحفظ و اَفہم ہوتے ہیں۔

یہی منی کا میدان ہے، مجمع سے دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہونچادیا؟ آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر **اللّٰهمَّ هل بلَّغت؟ اللّٰهمَّ هل بلَّغت؟ اللّٰهمَّ هَل بلّغت؟** کے ارشادفرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو مشہور ومتواتر فقرہ پر ختم کیا جاتا ہے، **ألا فليبلغ الشاهد الغائب** ۲؎، چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہونچاتا جائے، جس دردناک واثر انگیز ماحول میں اس کے خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن جذبات وہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا، اور کن کن طریقوں سے اس دعوت کو پہونچانے کی کوششیں کی ہونگی۔

۵۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہ کرام کو سناتے تھے یا کر کے دکھاتے تھے، اس کے متعلق صرف یہی حکم دے کر نہیں رہ جاتے تھے کہ تم بھی اس کو یاد رکھنا، بلکہ باضابطہ نگرانی فرماتے تھے، کہ اس حکم کی تعمیل کس حد تک کی جاتی ہے، اس کا اندازہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کو بتانے کے بعد فرمایا اچھا میں نے کیا کہا؟ اسے دہرادو؟ صحابی نے آخری فقرہ

۱؎ سنن ترمذی ۴۵۹/۴ ۲؎ بخاری ج ۲ ص ۸۳۳

آمنت بكتابك الذي أنزلت وبنبيك الذي أرسلت میں لفظ نبی کو ''رسول'' سے بدل دیا، جوتقریباً ہم معنی الفاظ ہیں، ارشاہوا کہ وہی کہو جو میں نے بتایا ہے ۱، یادرہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں جنہیں فرض وواجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔

۶۔ ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ صحابۂ کرام نے حضور کی مشہور حدیث سنی تھی ''من كذب عليَّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار ''(جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرلے) یوں بھی جس ایمان ویقین سے وہ سرفراز تھے، جس اعلی کردار کے مالک تھے، اس سے غلط بیانی کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

صحابۂ کرام کی تحصیلِ سنت کی کیفیت صحابہ کرام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر وحضر، بازار ومسجد میں ساتھ رہتے تھے اور آپ کی حیات طیبہ میں اپنی زندگی کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ تھا، ایک امتی جس طرح پیغمبر کو دیکھتا ہے، اسی نظر سے دیکھتے تھے، جن صحابہ نے آپ کو دیکھا اور آپ سے کوئی نہ کوئی روایت کی ان کی تعداد حافظ ابوزرعہ جو حدیث کے مشہور امام ہیں ان کی زبانی سنئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے آپ کو دیکھا اور آپ سے سنا ایک لاکھ ۲ سے زیادہ تھی، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، سب حضورؐ سے

---

۱ صحیح بخاری ج ۱/۳۸ باب فضل من بات علی الوضوء، وأخرجہ الترمذی وأبوداود فی کتاب الأدعیۃ۔

۲ لیکن خطیب نے ابوزرعہ سے ایک لاکھ کے بجائے ایک لاکھ چودہ ہزار کی روایت نقل کی ہے، حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ حالات صحابہ پر جو کتابیں موجود ہیں، ان میں دس ہزار سے زائد تعداد نہیں پائی جاتی، تدریب ص ۴۰۶، ۴۰۷

سن و دیکھ کر روایت کرتے تھے[1]۔

ظاہر بات ہے کہ یہ صحابہ کی تعداد جو حافظ ابوزرعہ نے بیان کی ہے بیک وقت اور ہر جگہ آپؐ کے ساتھ نہیں رہتی تھی، اگر چہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زائد مجمع آپ کے ساتھ جمع ہو گیا تھا، ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہ کی رہتی تھی، غزوات و اسفار میں جو آپ کے شریک رہے ان کی تعداد اتنی کبھی اکٹھی نہیں رہتی تھی، گرد و پیش کے ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضورؐ کے کسی نہ کسی قول و فعل کے محفوظ کرنے کا انھیں موقع ملا، اور اس کی اہمیت کے پیش نظر بعض صحابہ نے خدمت اقدس میں حاضری کے لیے باری مقرر کر لی تھی، ''بخاری'' میں حضرت عمر سے یہ روایت مروی ہے۔

كنت وجار لي من الأنصار في بني أمية بن زيد وهي من عوالي المدينة، وكنا نتناوب النزول فإذانزلت جئته بخبر ذٰلک اليوم من الوحي وغيره، وإذا نزل فعل مثل ذٰلک[2] .	میں اور میرا پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کی عوالی بستیوں میں سے ہے، ہم دونوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے پس جب میں حاضر ہوتا اس دن وحی وغیرہ کی خبر اس کے پاس لاتا اور جب وہ حاضر ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا۔

چونکہ حضور کی اتباع کو صحابۂ کرام تمام اوامر و نواہی میں واجب سمجھتے تھے، اس

---

[1] اصابہ ج۳ ص۳۰ وفتح المغیث ج۳ ص۱۰۱ [2] صحیح بخاری باب التناوب فی العلم رقم ۸۹

لیے مدینہ طیبہ سے دور کے قبائل اپنے نمائندوں کو بارگاہ رسالت میں اسلام کے احکام سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے، تاکہ یہ وفد واپس آ کر تعلیم وارشاد کی خدمت انجام دے سکے، چونکہ صحابۂ کرام میں تاجر بھی تھے، کاشتکار بھی اور مدینہ میں مقیم اور باہر رہنے والے بھی، اس لیے ظاہر بات ہے کہ سنت کا علم ان حضرات کو جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت کی ہے جیسے خلفاء راشدین اور عبداللہ بن مسعودؓ یا جنہیں آپ کی خدمت میں زیادہ رہنے کا موقع ملا ہے جیسے حضرت ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہ ہیں، ان لوگوں کو حضورؐ کے اقوال واحوال دوسرے صحابہ کی بہ نسبت زیادہ معلوم تھے، پھر ان میں کا ہر شخص اپنی علمی کمی کو دوسرے صحابی سے پوری کرتا تھا۔

طلب حدیث کے لیے صحابہ کی رحلت | آنحضرت ﷺ کے بعد بھی جن لوگوں کو آپؐ کی جن باتوں کا علم براہ راست نہ ہوتا تھا اس کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں یا ساتھیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اور اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں تھی۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ میری وابستگی کا حال چونکہ لوگوں کو معلوم تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے تھے، ان سے پوچھنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں اور عثمانؓ بھی، علیؓ بھی اور طلحہؓ وزبیرؓ بھی [1]، علم حدیث کی تکمیل کے شوق میں ایک صحابی نے دوسرے صحابی کے پاس اپنی علمی کمی کو پورا کرنے کے لیے سفر بھی کئے ہیں، امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں اور احمد وطبرانی نے حضرت جابر بن عبداللہ جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، ان کا بیان نقل کیا ہے کہ وہ

---

[1] تدوین حدیث بحوالہ طبقات ابن سعد

فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ کے صحابہ مین ایک صاحب کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ انھوں نے آنحضرت کی ایک حدیث سنی ہے، میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا، اوراس پراپنا کجاوہ کس کرایک ماہ تک چلتا رہااور ملک شام پہونچا، وہاں عبداللہ بن انیس (جن سے حدیث پہونچی تھی) کے گھر پہونچا اوراندر آدمی بھیجا کہ جا کر کہو کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہے، انھوں نے سننے کے ساتھ ہی پوچھا جابر بن عبداللہ؟ کہا جی ہاں! وہ فوراً باہر آئے اور گلے ملے پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ ایک حدیث پہونچی ہے، میں ڈرا کہ کہیں مجھے موت آجائے اوراس حدیث مبارک کے سننے سے محروم رہ جاؤں، یہ سن کر حضرت عبد اللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کردی [1]، وہ حدیث آخرت میں قصاص کے متعلق ہے۔

اسی طرح کا دلچسپ اورعبرت انگیز واقعہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ہے، ایک حدیث انھوں نے براہ راست آنحضرت ﷺ سے خود سنی تھی، مگرایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کواس میں کچھ شک پیدا ہوا، اس حدیث کے سننے کے وقت حضرت عقبہ بن عامر صحابیؓ بھی دربار رسالت میں موجود تھے، لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہوگئے تھے، سن کر حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لیے حضرت ابو ایوبؓ مصر روانہ ہوتے ہیں، اورعقبہ بن عامر کے پاس حاضر ہوکر فرماتے ہیں، مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جوتم نے آنحضرت ﷺ سے مسلمانوں کی پردہ پوشی کے متعلق سنی ہےاس حدیث کے سننے والوں میں میرے اورتمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا، حضرت عقبہ بن عامراس حدیث کوان کے سامنے دہراتے ہیں، حدیث تھی۔

---

[1] الادب المفرد ص۲۵۲ و جامع بیان العلم ج۱ ص۹۳

"من ستر مؤمنا في الدنيا على خزية ستره الله يوم القيامة" .
وہ سنتے ہیں، اس کے بعد کیا ہوتا ہے وہ اس سے بھی عجیب ہے، حضرت ابوایوبؓ یہ سنتے ہی فوراً اپنی سواری کی طرف پلٹے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے، واپسی میں اتنی جلدی کی کہ حضرت مسلمہؓ (والی مصر) نے نذرانہ ان کو بھیجا تھا، وہ بھی عریش مصر میں ان کو ملا [1]۔

یہ صحابہؓ کے واقعات ہیں، دور تابعین میں اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی، علم حدیث کی طلب میں سیکڑوں میل پا پیادہ طے کر لینا، براعظموں اور سمندروں کو پار کر لینا محدثین کے نزدیک معمولی بات بن گئی۔

روایت حدیث میں صحابہ کا طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام دین کی امانت کو لے کر مختلف شہروں میں پھیل گئے، جہاں جاتے تھے وہاں تابعین کا مجمع کثیر ان کے گرد جمع ہو جاتا اور لوگ مختلف جگہوں سے رختِ سفر باندھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اس طرح حدیث کے سلسلے کو بڑی اشاعت ہوئی، مگر جس طرح ان صحابہ نے حضور کے ان ارشادات کو سن رکھا تھا، ہر حاضر غائب کو پہونچائے [2]، اور اللہ تروتازہ رکھے اس شخص کو جس نے میری بات سنی، پس یاد کیا اور محفوظ رکھا اور اس کو پہونچایا جیسا کہ سنا ہے [3]۔

اسی طرح حضورؐ کی یہ حدیث: "كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ماسمع" [4] اور "من كذب عليَّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار"، یہ سب روایات ان کے سامنے تھیں، اس لئے صحابۂ کرام میں روایت حدیث کے سلسلے میں دو

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۹۴ [2] صحیح بخاری کتاب العلم ج ۱ ص ۲۵۷
[3] ابوداود ج ۳ ص ۳۲۲ [4] صحیح مسلم عن أبی ہریرہؓ ص ۲۲ رقم ۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵

طرح کے حضرات تھے، مقلّین (کم روایت کرنے والے) جیسے حضرت زبیرؓ، زید بن ارقم وعمران بن حصینؓ۔

چنانچہ بخاری میں عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد حضرت زبیرؓ سے کہا کہ میں آپ کو اس طرح حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں پاتا، جیسا کہ فلاں فلاں صاحب بیان کرتے ہیں، حضرت زبیرؓ نے جواب دیا، سنو میں حضورؐ سے جدا نہیں ہوا، لیکن میں نے آپؐ سے "**من كذب عليَّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار**"، سن رکھا ہے [۱]۔

دوسری جماعت جو مکثرین کے لقب سے مشہور ہے، جیسے ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، جابر بن عبداللہؓ، ابن عمرؓ، انس بن مالک، ابوسعید الخدریؓ۔

مکثرین صحابہ جن کی روایات کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے، ان میں حضرت ابن عباسؓ کے متعلق امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اخیر زندگی میں روایت کے سلسلے کو کم کر دیا تھا، فرماتے تھے کہ جب لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی تو ہم بھی اب صرف ان حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں [۲]۔

اسی طرح ابوہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کہ کیا آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی طرح حدیثیں بیان کرتے تھے؟ تو فرمایا کہ اگر عمرؓ کے زمانے میں ایسا کرتے تو مجھے دُرّے مارتے [۳]۔

مگر مکثرین صحابہؓ میں حضرت ابوہریرہؓ کے سوا اور کسی سے حضرت عمرؓ نے

---

[۱] فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۰ [۲] مقدمہ صحیح مسلم ص ۲۳
[۳] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷

تعرض نہیں کیا بلکہ روایت میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کثرت سے حدیثیں بیان کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ کیا تم ہمارے ساتھ موجود تھے جب حضور ﷺ فلاں مقام پر تشریف رکھتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ ہاں! میں نے حضور ﷺ کی حدیث ''**من كذب عليّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار**''، سن رکھی ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا جب واقعہ یہ ہے تو '' **فاذهب فحدث**'' جاؤ، حدیث بیان کرو[1]۔

حضرت عمرؓ کی کثرتِ روایت سے منع کرنے کی مصلحت

حافظ ابن عبدالبر مالکی نے لکھا ہے کہ کثرتِ روایت سے ممانعت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اس لئے دیا تھا کہ کثرت کی صورت میں آنحضرت ﷺ کی طرف غلط بات کے منسوب ہوجانے کا اندیشہ تھا، نیز اس کا بھی خوف تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں، اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے پر لوگ جری ہوجائیں گے[2]۔

مگر علامہ ابن حزم نے یہ روایت درج کی ہے کہ **روي عن عمرؓ أنه حبس ابن مسعودؓ من أجل التحديث عن النبيؐ و أبا الدرداء وأباذر**[3]، حضرت عمرؓ نے حدیث بیان کرنے سے ابن مسعودؓ، ابودرداءؓ، ابوذرؓ کو قید کردیا تھا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس روایت کا حضرت عمرؓ کی طرف انتساب صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن کا سماع حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں، کیوں کہ ابراہیم کی ولادت حضرت عمرؓ کے اخیر دور خلافت ۲۰ھ میں ہوئی ہے،

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۸ص۱۰۷، وسیر أعلام النبلاء ج۲ص۴۲۴ [2] جامع بیان العلم ج۲ص۱۲۲

[3] الأحکام لابن حزم ج۲ص۱۹۳

اس لئے ان سے سماع کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں اس طرح کی بعض دوسری روایتوں کو درج کر کے لکھا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

''جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا، سنت یعنی حضورؐ کی حدیثوں سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں، انہوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کرنا چاہتے تھے، آخر میں حافظ نے لکھا ہے کہ ان روایتوں کی صحت مشکوک ہے [1]، اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو بالآخر اجازت دے دی تھی، پھر ان تینوں حضرات کو کس طرح روک سکتے تھے، کیونکہ ابودرداءؓ وابوذرؓ سے روایات زیادہ مروی نہیں ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ کا معلم بنا کر بھیجا تھا''۔

کیا قبول حدیث کے لئے صحابہؓ نے مزید شرائط مقرر کئے تھے؟:

شیخین حضرت ابوبکر صدیقؓ وحضرت عمر فاروقؓ کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں نے حدیث کو قبول کرنے کے لئے دو راوی کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ قسم لیتے تھے [2]، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کا مسلک جمہور صحابہؓ کے خلاف نہیں تھا، ہر صحابی دوسرے پر اعتماد کرتا تھا۔

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱ [2] وكان (أي عليؓ) إماماً متحرياً في الأخذ بحيث إنه يستحلف من يحدثه بالحديث ، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰

حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جدہ (دادی) کی وراثت کے مسئلے میں حضرت ابوبکرؓ نے تنہا حضرت مغیرہ کی حدیث سنی تو دریافت فرمایا **هــل مــعک أحــد** ؟ کیا تمہارے ساتھ اس خبر کے بیان کرنے میں کوئی دوسرا بھی شریک ہے، تو محمدؓ بن مسلمہ نے بھی اس کی شہادت دی، اس مسئلے کے سوا اور کہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی صحابی کی روایت سن کر اس پر شہادت طلب کی ہو، اس روایت کی سند کو علامہ ابن حزم نے منقطع قرار دیا ہے [۱]۔

اگر روایت کی صحت کسی درجہ میں تسلیم کر لی جائے تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر توقف کے مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں [۲]، کیوں کہ یہ بات یقینی ہے کہ خبر واحد کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبول فرمایا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی، بجنسہ یہی حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل ہے، اس لئے آپ نے چاہا کہ اور کوئی صاحب جانتے ہوں تو بیان کر دیں، چنانچہ رازی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دو صحابیوں کے درمیان فیصلہ کیا، جب حضرت بلالؓ نے بتایا کہ حضور ﷺ کا فیصلہ اس کے خلاف ہے تو رجوع کر لیا، اسی طرح مذی کے مسئلہ میں بغیر قسم لئے ہوئے حضرت مقدادؓ کی روایت کو حضرت علیؓ نے قبول کیا ہے [۳]، حضرت عمرؓ کے متعلق صرف دو واقعات ایسے ملے ہیں جن میں انہوں نے ایک راوی پر مزید دوسرے کی گواہی طلب کی۔

(ا) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا دلچسپ واقعہ ہے، جس کو حضرت ابوسعید

---

[۱] الأحکام لابن حزم ج۱ص۱۴۱ [۲] المستصفیٰ للغزالی ج۱ص۱۵۴

[۳] السنۃ ومکانتہا ص۸۵ بحوالہ المحصول للرازی۔

خدریؓ نے بیان کیا کہ ابوموسیٰؓ نے حضرت عمرؓ کو دروازے کے باہر سے تین مرتبہ سلام کیا، جب تیسری مرتبہ جواب نہ ملا تو واپس لوٹ آئے، حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا اور ان کو واپس بلایا، اور یہ فرمایا کہ کیوں واپس لوٹ گئے تھے؟ ابوموسیٰ اشعریؓ نے جواب دیا کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: "**إذا سلم أحدكم ثلاثاً فلم يجب فليرجع**" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس پر شہادت پیش کرو ورنہ تمہارے ساتھ میں کچھ کروں گا، پس ابوموسیٰؓ ہمارے پاس (انصار کا ایک مجمع تھا) آئے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا، ہم نے کہا کہ کیا حال ہے؟ ہمارے سامنے پورا واقعہ سنایا اور دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہم سب نے سنی ہے، پس لوگوں نے اس مجمع میں سے ایک صاحب کو بھیجا تو انہوں نے جا کر حدیث سنائی۔ (رواہ مسلم ص۸۸۸، رقم ۲۱۵۷)

اس روایت میں اتنا اضافہ ہے:

أما إني لم أتهمك ولكني خشيت أن يتقول الناس علىٰ رسول الله [۱].	حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلط بیانی میں تم کو متہم نہیں کرنا چاہتا بلکہ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوگ جھوٹی باتیں منسوب نہ کرنے لگیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت اُبیؓ نے حضرت عمرؓ پر اعتراض بھی کیا تھا، بعض میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصود تثبت تھا۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنین کے متعلق جب حضرت مغیرہؓ نے حدیث سنائی

---

[۱] موطأ مالک ص۹۶۴، وتذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۸

تو حضرت عمرؓ نے ان سے شہادت طلب کی، پس محمدؓ بن مسلمہ نے شہادت دی[۱]۔

بہر حال حضرت عمرؓ کا مقصود بھی اس طرز عمل سے یہی تھا کہ روایتِ حدیث میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ورنہ بہت سے مواقع پر حضرت عمرؓ نے صرف ایک صحابی کی روایت پر عمل کیا ہے، سفر شام میں جب مقام سرغ پر پہونچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں طاعون ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جب حضور ﷺ کی حدیث سنائی، تو سن کر واپس آ گئے[۲]، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ مسلسل ایک راوی کی روایت پر اعتماد کرتے رہے ہیں، اس کے بکثرت واقعات ہیں، اس عنوان پر مستقل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے، چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے ان روایتوں کو ''الکفایہ'' میں مستقل ایک باب میں جمع کر دیا ہے۔

اخبار آحاد کا مرتبہ | اصطلاح میں خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں جو متواتر نہ ہو[*]، اگر تواتر کا عدد کسی طبقے میں پورا نہ ہو تو اس کو خبر واحد ہی کہا جائے گا، خواہ وہ کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو، حضور ﷺ وصحابہ کرامؓ نے اس کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور ہر زمانے کے علماء اور فقہاء نے واجب العمل قرار دیا ہے، امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف ''الرسالہ'' (ص ۳۱۹) میں بہت سی آیات اور احادیث سے ثابت کیا ہے کہ اخبار آحاد قابل اعتماد اور واجب العمل ہیں۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸ صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۳۱۱

[۲] الرسالہ از شافعیؒ ص ۱۳۴، وصحیح بخاری ج ۴ ص ۶۴، وصحیح مسلم رقم ۲۱۹

[*] منکرین حدیث نے نادانی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ احادیث متواترہ بہت محدود وقلیل ہیں، حالاں کہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، دین کا بہت بڑا حصہ تواتر وتوارث کی راہ سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''معارف السنن'' ص ۱۰۵ تا ۱۰۸)

حضورﷺ نے مختلف جگہوں پر لوگوں کو دعوت وتبلیغ کے لئے بھیجا تھا، اس میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں فرمایا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خبر واحد حجتِ شرعی ہے، اگرچہ اس کے اندر خطا کا امکان عقلی موجود ہے، مگر عقل وفطرت انسانی کے نزدیک اس قسم کے احتمالِ عقلی کا کوئی اعتبار نہیں، اور عرفاً اس کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

معتزلہ وغیرہ جو اخبار آحاد کی افادیت کے منکر ہیں، ان پر شیخ الاسلام علامہ بزدویؒ کی بات پورے طور سے صادق آتی ہے:۔

من أنکر العلم بطریق الخبر أصلاً فهذا رجل سفیه لم یعرف نفسه ولا دینه ولا دنیاه ولا أمه ولا أباه[۱].	جس نے خبر واحد کا انکار کیا وہ در اصل ایک بے وقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو نہ دنیا کو، نہ اپنی ماں کو، نہ اپنے باپ کو۔

محدثین نے اخبار آحاد کے متعلق جو یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ قرائن نہ ہوں تو ظن کا فائدہ دیتی ہے جس طرح خبر متواتر یقین کا فائدہ دیتی ہے، مگر وہ ظن جس کا فائدہ اخبار آحاد دیتی ہے، وہ یقین سے زیادہ قریب ہے، محدثین نے اس کو ظنی ''اصطلاحی'' معنی میں قرآنیات کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے، کہاں وہ ظنی اصطلاحی اور کہاں یہ بول چال والا گمان جو شک وشبہہ اور بے اعتباری کے موقع پر بولا جاتا ہے، دونوں کو ایک درجہ کی چیز سمجھنا نہایت ہی جہالت ہے، جیسے کوئی قیاس کو محض اٹکل کے معنی میں لے کر قیاس منطقی کی جو استدلال کی مستقل شکل ہے ہنسی اڑانے لگے، یہ

---

[۱] أصول البزدوی ج۲ص۳۶۲

تمسخر فن منطق پر نہ ہوگا، بلکہ اپنی بے علمی پر ہوگا، اگر خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے تو بہت سے دنیاوی معاملات معطل ہوکر رہ جائیں گے۔

کتابتِ حدیث حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے والوں کی طرف سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ حدیثیں آنحضرت ﷺ کے زمانے میں قلم بند نہیں کی گئی تھیں، بلکہ لکھنے کی خود آپؐ نے ممانعت فرمادی تھی، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث ہے:۔

لا تكتبوا عني ومن كتب عني غير القرآن فليمحه وحدثوا عني ولاحرج ومن كذب عليّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار [1].	مجھ سے کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے وہ اسے چاہئے کہ مٹادے اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو، اس میں کچھ حرج نہیں اور جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بولا اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنالے۔

امام بخاریؒ وغیرہ دیگر محدثین کے نزدیک اس روایت پر کلام ہے، ان کی تحقیق میں یہ الفاظ حضور ﷺ کے نہیں ہیں، بلکہ خود ابوسعید خدریؓ کے ہیں، جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کردیا ہے [2]، لیکن بالفرض اگر اس حدیث کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ ممانعت وقتی وعارضی تھی، جو اس زمانے میں خاص طور سے حفاظت قرآن کے سلسلے میں دی گئی تھی، چونکہ حق تعالیٰ شانہ نے حضور ﷺ کو ''جوامع الکلم'' عطا فرمائے تھے اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نئے نئے لوگ جو ابھی ابھی

---

[1] مسلم ج۴ باب التثبت في الحديث ص۲۲۹۸ [2] فتح الباری ج۱ ص۱۸۵

قرآن سے آشنا ہورہے ہیں کہیں دونوں کوخلط ملط نہ کردیں، ادھر آپ ؐکو اپنی قوم کے حافظے پر اعتماد تھا، مگر جب قرآن سے اشتباہ کا اندیشہ جاتا رہا تو کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی گئی، بلکہ روایات سے آپ کا خود لکھوانا واملا کرانا ثابت ہے۔

(۱) جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاریؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں بیٹھتے، آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رکھ پاتے، آخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی یارسول اللہؐ میں آپؐ سے حدیث سُنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہے مگر میں اسے یادنہیں رکھ سکتا، اس پر آپؐ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ ''**استعن بیمینک وأومأ بیده للخط** [۱]'' اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لواور اپنے دست مبارک سے لکھنے کی طرف اشارہ کیا۔

(۲) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بارگاہ نبویؐ میں شکایت کی کہ ''**یارسول اللہ إنا نسمع منک أشیاء فنکتبها**'' یارسول اللہؐ ہم آپ ﷺ کی زبانی بہت سی باتیں سنتے ہیں اوراس کولکھ لیتے ہیں تو اس کی نسبت کیا حکم ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، لکھتے رہو، اس میں کوئی حرج نہیں [۲]۔

حضرت رافعؓ بن خدیج کے بیان سے معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ وہ حدیثیں سن کر لکھ لیتے تھے۔

(۳) حاکم صاحبِ ''مستدرک'' نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص

---

[۱] جامع ترمذی باب ماجاء في الرخصة في كتابة العلم ج۲ص۹۱

[۲] مجمع الزوائد ج۱ص۱۵۱ بحوالہ طبرانی ج۴ص۲۷۶

رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ:

قیدوا العلم بالکتاب. علم کو قید کتابت میں لے آؤ ۱؎۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ مسلّم ہے کہ قرآن مجید کی طرح حدیث کی تدوین کی طرف توجہ نہیں کی گئی، چونکہ نہی و اجازت دونوں روایات سے ثابت ہیں، اس لئے اکثر لوگوں نے نہی کو منسوخ سمجھا، البتہ بعض علماء کا خیال تھا کہ نہی ان لوگوں کے لئے ہے جن سے قرآن وسنت میں التباس و غلطی کا امکان تھا اور جن کے متعلق اطمینان تھا انہیں لکھنے کی اجازت تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ دونوں طرح کی روایات میں تعارض نہیں، کیونکہ قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت میں زیادہ اہتمام وعمومیت کا رنگ نہیں دیا گیا، بلکہ انفرادی وشخصی طور پر لکھنے کی اجازت تھی، اس کے مطابق بعض لوگوں نے لکھا، اس کی تائید ضحاک کے قول سے بھی ہوتی ہے، انہوں نے فرمایا:

لا تتخذوا للحدیث کراریس ککراریس المصاحف. تم لوگ حدیث کے لئے کاپیاں نہ بناؤ جس طرح کی مصاحف کی کاپیاں ہیں ۲؎۔

خود آنحضرت ﷺ کا احکام وہدایات کو قلم بند کروانا آنحضرت ﷺ نے نہ صرف یہ کہ کتابتِ حدیث کی اجازت دی تھی بلکہ بہت سے مواقع پر آپ ﷺ کا لکھوانا اور املا کرانا بھی ثابت ہے۔

(۱) فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا تھا، ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ ابوشاہ یمنیؓ ایک صحابی کی درخواست پر آپ ﷺ نے یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کرنے کا

۱؎ مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۸۸، جامع بیان العلم ۱/۷۲ ۲؎ تقیید العلم ص ۴۷

حکم دیا تھا۱۔

(۲) ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجمع سے پوچھا کہ کسی کو معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شوہر کی دیت میں بیوی کو کیا دلایا ہے؟ ضحاکؒ بن سفیان نے کھڑے ہوکر کہا کہ مجھے معلوم ہے، آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہ لکھوا کر بھیجا تھا۲۔

(۳) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جب ۱۰ھ میں آپؐ نے نجران پر عامل بنا کر بھیجا تو ایک تحریر لکھوا کران کے حوالے کی تھی، حافظ ابن عبدالبر مالکیؒ لکھتے ہیں:

وكتب رسول الله ﷺ كتاب الصدقات والديات والفرائض والسنن لعمرو بن حزم وغيره ۳.	رسول اللہ ﷺ نے عمر بن حزمؓ کے لئے صدقات، دیات، فرائض، وسنن کے متعلق ایک کتاب تحریر کروائی تھی۔

محمد بن شہاب زہریؒ کا بیان ہے کہ یہ کتاب چمڑے پر تحریر تھی اور عمرو بن حزمؓ کے پوتے ابوبکر بن حزم کے پاس موجود تھی، وہ یہ کتاب میرے پاس بھی لے کر آئے تھے اور میں نے اس کو پڑھا تھا۴۔

علامہ زیلعیؒ بعض حفاظ سے ناقل ہیں کہ عمرو بن حزمؓ کی کتاب کے نسخہ کو ائمہ اربعہؒ نے قبول کیا ہے اور یہ نسخہ بھی عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ کے نسخے کی طرح متوارث ہے۵۔

---

۱ صحیح بخاری باب کتابۃ العلم ۲ سنن دارقطنی ج۲ص۴۸۵ وجامع ترمذی ج۱ص۱۷۰

۳ جامع بیان العلم ج۱ص۱۷ باب الرخصة في كتابة العلم

۴ سنن نسائی ۳۸۰/۴ ۵ نصب الرایہ ج۳ص۳۴۲

(۴) حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی وفات سے ایک ماہ پیشتر قبیلہ جہینہ کی طرف یہ لکھوا کر بھیجا تھا کہ مردار کی کھال اور پٹھوں کو کام میں نہ لایا جائے، ''جامع ترمذی'' میں وفات سے دو ماہ قبل مذکور ہے [1]۔

ہم نے ان چند تحریروں کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ مختلف قبائل و افراد کے نام خطوط و تحریری احکام اور صلح نامے و دعوت نامے وغیرہ جو آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً لکھوائے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اس پر مستقل علماء نے کتابیں لکھی ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور کتابت حدیث | چونکہ حضور ﷺ کی طرف سے کتابت حدیث کی عام اجازت دے دی گئی تھی [2]، اس لئے بہت سے حضرات صحابہؓ نے انفرادی و شخصی طور پر حدیثوں کے مجموعے تحریری شکل میں تیار کئے تھے اور بعض حضرات نے اپنے تلامذہ کے ذریعہ قلم بند کرایا تھا۔

مگر واقعہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں کتابت حدیث کا عام رواج نہ ہوا، اس کے مختلف اسباب ہیں:

۱۔ صحابہ کرامؓ کی جماعت مختصر تھی، انہیں دین سارے عالم میں پہونچانا تھا، تصنیف و تالیف کے لئے سکون و اطمینان کی ضرورت ہے۔

۲۔ وہ حافظے کے نہایت قوی تھے، انہیں کتابت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

۳۔ عام طور پر عربوں میں لکھنے کا رواج نہیں تھا، اس لئے بھی اس کی طرف

---

[1] سنن أبی داود باب من روی أن لا ينتفع بإهاب الميتة برقم ۴۱۲۸ و جامع ترمذی ج ۱ ص ۴۳

[2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۲

زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں، مجھ سے زیادہ ان کے پاس حدیث کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنتے اس کو لکھتے جاتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا[۱]۔

''ابوداود'' و''مسند احمد'' میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوش ہوتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو، عبداللہ بن عمروؓ نے اس بناء پر لکھنا چھوڑ دیا اور آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے[۲]۔

عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے اس صحیفہ کا نام صادقہ رکھا تھا[۳]، اور کہا کرتے تھے کہ مجھے زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کر رکھی ہے، جس میں ایک صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو آنحضرت ﷺ سے سن کر میں نے لکھا ہے[۴]، یہ صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی وفات پر ان کے پوتے شعیب بن محمد بن عبداللہؒ کو ملا تھا، اور شعیب سے ان کے صاحبزادے عمرو روایت کرتے ہیں[۵]، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں جتنی روایتیں اس سلسلہ سے منقول ہیں وہ سب صحیفہ صادقہ کی حدیثیں ہیں۔

(۲) ہبیرہ بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ

---

[۱] صحیح بخاری ج۱ ص۷۹ رقم ۱۱۳ باب کتابۃ العلم [۲] ابوداود ج۲ ص۱۳۵
[۳] طبقات ابن سعد ج۲ ص۱۲۵ [۴] سنن دارمی ج۱ ص۶۹ [۵] جامع ترمذی ج۱ ص۴۳

لگاتے تو وہ اپنے پاس سے ایک نوشتہ نکالتے اور فرماتے کہ یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت ﷺ سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور ﷺ پر پیش کر چکا ہوں [۱]۔

(۳) امام ترمذیؒ نے ''کتاب العلل'' میں عکرمہؒ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کی کتابوں کو پڑھنے لگے [۲]۔

(۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک صحیفہ تھا، جس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بجز قرآن کے اور جو کچھ اس صحیفہ میں درج ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا، یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلہ میں تھا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار مع نیام کے رکھی رہتی تھی [۳]۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن ایک کتاب نکال کر لائے اور قسم کھا کر کہا کہ یہ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے [۴]۔

(۶) حافظ ابن حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں امام حسن بصریؒ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہؓ بن جندب سے حدیث کا ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے، جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں منقول ہیں، علی بن المدینی اور امام بخاری دونوں نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں ان کی مسموعہ تھیں، لیکن یحییٰ بن سعید القطان اور دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ سب نوشتہ سے روایت ہیں، اس نسخہ کو امام

---

[۱] تقیید العلم ص ۹۵ [۲] جامع ترمذی کتاب العلل
[۳] صحیح مسلم باب تحریم الذبح لغیر اللہ ص ۱۰۶۷ [۴] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۱۷

حسن کے علاوہ حضرت سمرہؓ بن جندب کے صاحبزادے سلیمان بن سمرہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: **روی عن أبيه نسخة كبيرة** [۱].

ہم نے صحابہ کرام کی چند مشہور تحریروں کا یہاں ذکر کیا ہے، ورنہ ان کے تمام نوشتے جس میں کسی حدیث کے لکھنے کا ذکر ہے، اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے [۲]۔

عہد نبویؐ کا تحریری سرمایہ | ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوتؐ اور دورِ صحابہؓ میں کس قدر احادیث کا سرمایہ تحریری شکل میں آچکا تھا؟ اگر غور و فکر، تحقیق و جستجو سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ حدیث نبویؐ کی اشاعت جس طرح تواتر عملی و روایت دونوں ذریعوں سے مسلسل ہوتی رہی ہے، اسی طرح آج ہمارے پاس جو حدیث کا سرمایہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس کا غالب ترین حصہ دورِ نبوت ہی میں قلم بند ہو چکا تھا، حاکم صاحبِ ''مستدرک'' جو نقد روایت میں متساہل مشہور ہیں، وہ اپنے تلاش و جستجو کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: **والاحاديث التي في الدرجة الأولىٰ لا تبلغ عشرة آلاف** [۳]، اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچ پاتی۔

ہر طرح کی روایات جو مسانید و جوامع، سنن و معاجم اور فوائد و رسائل میں موجود ہیں، ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے بھی کم ہے [۴]، ان تمام کتابوں سے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج۴ ص۱۹۸ [۲] ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی کتاب ''دراسات في الحديث النبوي وتاريخ تدوينه'' اس موضوع پر اہم کتاب ہے جو متعدد بار شایع ہو چکی ہے۔

[۳] توجیہ النظر ص۹۳ [۴] توجیہ النظر ص۹۳

چھان بین کر جو تعداد حاکم نے اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی پیش کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس بیان کو بھی سامنے رکھئے کہ عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کو مجھ سے زیادہ حدیثیں اس لئے یاد تھیں کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا، محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے، اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیثوں کی تعداد یقیناً پانچ ہزار تین سو چوہتر سے زائد ہونی چاہئے، جو قید تحریر میں آ چکی تھیں، حضرت عبداللہ بن عمرو کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ کے نوشتے اور خود آنحضرت ﷺ کے سینکڑوں احکامات و ہدایات جو آپؐ نے املا کرایا تھا، ان سب کی مجموعی تعداد اگر جوڑ لی جائے تو اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ دس ہزار سے زیادہ حدیثیں دور نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

البتہ ایک شبہہ یہاں یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جہاں حفاظ حدیث کی روایات کی تعداد ذکر کی جاتی ہے، وہاں ان کی تعداد بہت زائد بتائی گئی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو سات لاکھ سے زائد قابل اعتماد حدیثوں کا حصہ محفوظ تھا، حافظ ابوزرعہ رازی کی حدیثوں کی تعداد سات لاکھ بتائی گئی ہے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، امام مسلم کا دعویٰ ہے کہ میں نے اپنی ''جامع صحیح'' کو تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے، حافظ ابن الجوزی ان اعداد کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: **إن المراد بهذا العدد الطرق لا المتون** [۱]، یعنی ان اعداد سے مراد حدیثوں کے متون نہیں بلکہ طرق و اسانید مراد ہیں، مثلاً ایک ہی حدیث کو کسی

---

[۱] تلقیح فہوم أہل الأثر ص ۱۸۷

شخص نے دس شاگردوں سے بیان کیا تو محدثین کی اصطلاح میں اس کے دس طرق و دس اسانید ہوگئے، اور ایک کے بجائے ان مختلف طریقوں سے اس کا شمار کیا جائے گا، جیسے ''**إنما الأعمال بالنيات**'' کی حدیث سات سو طریقوں سے روایت کی گئی ہے، اس لئے اس ایک حدیث کی تعداد سات سو ہوجاتی ہے، یہی حال اکثر و بیشتر حدیثوں کا ہے، ''صحیح بخاری'' جس کے غیر مکرر روایات کی تعداد دو ہزار چھ سو سات (۲۶۰۷) اور ''صحیح مسلم'' کی چار ہزار ہے، ان دونوں کتابوں کی اکثر روایات میں اشتراک بھی ہے، محدث جوزقی نے ان دونوں کتابوں کی احادیث کا استخراج دیگر کتب سے کیا تو اسانید کی تعداد پچیس ہزار چار سو اسّی ہوگئی۔

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ صحابہ کرامؓ کے اقوال وفتاوے بلکہ تابعین و تبع تابعین کی چیزوں کو بھی لوگوں نے حدیث کے نیچے درج کیا، اس لئے بھی قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے[۱]۔

تابعین اور کتابت حدیث ایک غلط فہمی یہ پیدا کی جارہی ہے کہ احادیث کی تدوین وتحریر کا کام تابعین نے شروع کیا اور تابعین ان کو کہتے ہیں جنہوں نے صحابہ کو دیکھا اور ان سے فیض پایا اور صحابہ کا زمانہ حضور ﷺ کے بعد تقریباً سو سال تک رہا، گویا تابعین کا عہد سو سال بعد شروع ہوا، اس طرح تدوین وتحریر کے سلسلہ کا آغاز سو برس بعد ہوا، حالانکہ یہ تمام تر غلط ہے، تابعین ان کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا اور صحابہ کی زیارت کی، اور ان سے مستفید ہوئے عام اس سے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے ہوں مگر زیارت کا موقع نہیں ملا یا عہد نبویؐ

---

[۱] توجیہ النظر ص ۹۳

کے اخیر میں پیدا ہوئے اس لئے آپ ؐ سے فیضیاب نہیں ہو سکے یا آپ کی وفات ۱۲/ ربیع الاول ۱۱ھ کے بعد پیدا ہوئے، وہ سب تابعین میں داخل ہیں اس طرح دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تابعین کا عہد آپ ؐ کی زندگی ہی میں اور کم سے کم یہ کہ ۱۱ھ سے شروع ہو گیا تھا، اس لئے ۱۱ھ سے جو کام شروع ہوا اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا، تابعین کا کارنامہ ہونے کے لئے ایک ایک صحابی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی سو برس کا زمانہ گزرنے کی حاجت ہے، وہ تو تابعیت کا آخری عہد ہے جس کے بعد تابعیت کے شرف کا خاتمہ ہوتا ہے، کیوں کہ یہی صحابہؓ کے عہد کا خاتمہ ہے جن کے دیدار سے تابعی بنتے تھے۔

الغرض اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ یہ کہنا کس درجہ کا دھوکہ ہے کہ مسلمانوں میں احادیث کی تدوین وتحریر کا کام سو برس بعد شروع ہوا[۱]، تابعین کے ذریعے کتابت حدیث کو اور زیادہ رواج ہوا، اب ہم یہاں ان کے بعض نوشتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ خود ان کی حدیثوں کا تیار کر کے ان کو پڑھ کر سنایا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن بشير بن نهيك قال:	میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو حدیثیں
كنت أكتب ما أسمع من أبي	سنتا تھا لکھ لیتا، پھر جب میں نے اس
هريرةؓ فلما أردت أن أفارقه	سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو

---

[۱] خطبات مدراس ص ۸۸ وتوجیہ النظر ص ۱۷۳

أتيته بكتابه فقرأت عليه و قلت: أهذا ما سمعتُ منک؟ قال: نعم[1].

اس کتاب کو لے کران کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کوان کے سامنے پڑھ کر سنایااور پھران سے عرض کیا کہ یہ سب وہی حدیثیں ہیں جو آپ سے میں نے سنی ہیں؟ فرمانے لگے ''ہاں''۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جو یمن کے امراء میں سے تھے، ایک زمانے تک ان کی خدمت میں رہےاوران کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے، امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا بہت بڑا حصہ اپنی ''مسند'' میں داخل کر دیا ہے، شیخین نے بھی متفرق طور پر اس سے روایت کیا ہے[2]، آج یہ صحیفہ مجمع علمی دمشق سے چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

(۳) سعید بن جبیر مشہور تابعی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا صحیفہ میں لکھتا رہتا تھا[3]۔

(۴) ''سنن دارمی'' میں مسلم بن قیس کا بیان مذکور ہے ''رأيت أبان يكتب عند أنس'' میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں[4]۔

(۵) عمرۃ بنت عبدالرحمٰن جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہ کے باب میں ان کا شمار تقریباً عروہ کے برابر ہے، ان ہی عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن حزم نے حضرت عمر بن

---

[1] سنن دارمی باب من رخص کتابۃ العلم ج ۱ ص ۱۲۸ وتقیید العلم ص ۱۰۱ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ ہمام بن منبہ [3] سنن دارمی ج ۱ ص ۱۲۸ [4] حوالۂ مذکور

عبدالعزیزؒ کے مشہور فرمان کی بنیاد پر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) جمع کرلیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

أن یکتب لہ من العلم والأدب ما عندہ من عمرة بنت عبدالرحمٰن والقاسم ابن محمد ۱؎ ۔

یہ کہ وہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (احادیث) کو اور ادب کو ان کے لئے تیار کریں۔

قاسم بن محمد حضرت صدیقہؓ کے بھتیجے تھے اور ان کے پروردہ وتربیت یافتہ تھے جنہوں نے سب کچھ ان سے سیکھا تھا، بہرحال حضرت عائشہؓ کی احادیث ان ہی دونوں کے ذریعہ ابوبکر بن محمد نے جمع کیں۔

ہم نے تابعین کرام کی چند تحریروں اور صحیفوں کے ذکر پر اکتفا کیا ورنہ یہ حضرات مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، انہوں نے صحابہؓ کی زندگی ہی میں ان کی تمام مرویات وواقعات وحالات کو ایک ایک سے پوچھ کر، ایک ایک کے دروازہ پر جا کر بوڑھے، جوان، عورت ومرد ہر ایک سے تحقیق کر کے ہمارے لئے فراہم کردیا تھا، محمد بن شہاب زہری جو حدیث وسیرت کے بڑے امام ہیں، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ایک ایک چیز کو لکھا، ابوالزناد کہتے ہیں کہ ہم صرف حلال وحرام لکھتے رہتے تھے، زہری جو کچھ سنتے تھے وہ سب لکھتے جاتے تھے ۲؎، احادیث کو قید تحریر میں لانے والے سینکڑوں تابعین تھے جن میں صرف امام زہری کی تحریروں کا اتنا انبار تھا کہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد زہری کے یہ دفتر جانوروں پر بار کر کے خزانہ سے لائے گئے

۱؎ تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن حزم ۲؎ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۷

تھے ۱؎۔

اگرچہ حفاظت حدیث کے لئے کتابت وحفظ ان دونوں طریقوں کو اختیار کیا گیا تھا مگر پہلی صدی تک علماء عام طور پر کتابت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ جو کچھ لکھتے تھے اس سے مقصود زبانی یاد کرنا ہوتا تھا۔

امام مالکؒ، سلف یعنی بہت سے تابعین کا یہ دستور بیان کرتے ہیں کہ ان میں بعض لوگ حدیثوں کو لکھ کر یاد کرتے اور جب یاد ہوجاتی تھیں تو مٹا دیتے تھے ۲؎، یہ دستور ایک زمانے تک رہا، محمد بن سیرینؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا بھی قاعدہ تھا کہ حدیثوں کو لکھ لیتے تھے "فإذا حفظه محاه ۳؎"، یعنی جب یاد کر لیتے تھے تو مٹا دیتے تھے، اس کی وجہ یہی ہے کہ عربوں کا حافظہ فطرۃً نہایت ہی قوی تھا، علامہ ذہبی نے ابن خزیمہ کے متعلق یہ الفاظ ابوعلی نیشاپوری کے حوالہ سے نقل کئے ہیں کہ:

كان ابن خزيمة يحفظ الفقهيات من حديثه كما يحفظ القارئ السورة ۴؎.	فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے تھے جیسے کہ قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

قتادہ تابعی فرماتے ہیں کہ "**أعطى الله هذه الأمة من الحفظ مالم يعط أحداً من الأمم خاصة خصهم بها وكرامة أكرمهم بها ۵؎**"، یعنی حق تعالیٰ شانہ نے اس امت (امت محمدیہﷺ) کو حفظ و یادداشت کی غیر معمولی قوت سے سرفراز فرمایا ہے کہ دنیا کی قوموں اور امتوں کے درمیان (امت اسلامیہ) کا یہ خاص

۱؎ طبقات ابن سعد ج۲ ص۱۳۵ ۲؎ جامع بیان العلم ج۱ ص۶۴ ۳؎ ابن سعد ج۷ ص۱۰۸
۴؎ تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۱ ۵؎ زرقانی ج۵ ص۳۹۵

امتیازی سرمایہ ہے، جس کے ساتھ خدا نے اس کومختص کیا، اور یہ نوازش ہے جس کے ذریعہ نوازا گیا۔

تدوین حدیث | پہلی صدی کے اختتام تک کتابت حدیث کا مسئلہ نہایت مختلف فیہ رہا مگر قرآن مجید کی اس قدر اشاعت ہوچکی تھی کہ اب اس سے التباس واشتباہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور اسلام عرب سے باہر عجم کے بہت سے ملکوں پر حکمراں تھا، بکثرت لوگ اسلام میں داخل ہورہے تھے، نئے مسائل اور نئے حالات سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، اس وقت فوری ضرورت تھی کہ حدیث وسنت کے سرمایہ کو جو صحابہؓ وتابعین سے منتقل ہوتا چلا آرہا تھا مدون کیا جائے اور وہ علم جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا، اس کو محفوظ کیا جائے۔

ادھر وہ متبرک نفوس جنہوں نے براہ راست زبان نبوت سے احادیث سنی تھیں اور آپ ﷺ کی زندگی کے ہر خدوخال کو محفوظ کئے ہوئے تھے یعنی صحابۂ کرامؓ ان کے وجود سے بزم عالم خالی ہورہی تھی۔

جب خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ صفر ۹۹ھ میں منصب خلافت پر فائز ہوئے جن کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، انہوں نے دیکھا کہ روافض وخوارج اور قدریہ وغیرہ نئے نئے فرقے سر اٹھا رہے ہیں، اس لئے حدیث وسنت کے باقاعدہ تدوین کی ضرورت ہے۔

قاضی ابوبکر بن حزم خزرجی انصاری المتوفی ۱۲۰ھ جو بڑے پایہ کے عالم تھے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں جس قدر قضا کا ان کو علم تھا اور کسی کو نہیں تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مدینہ کے قاضی آپ ہی تھے، اس لئے ان کو

حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:

انظر ما كان من حديث	آنخضرت ﷺ کی جو کچھ حدیثیں تم
رسول الله ﷺ فاكتبه لي	کو ملیں، ان کو تحریری شکل میں لے
فإني خفت دروس العلم و	آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ
ذهاب العلماء۱؎.	علم مٹ جائے گا اور علماء رخصت
	ہو جائیں گے۔

خاص طور سے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد کے ذخیرہ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کیا جائے ۲؎، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو فرمان بھیجا تھا امام محمدؒ نے اپنی ''موطأ'' میں زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے:

''إن عمر بن عبدالعزيز كتب	حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر
إلىٰ أبي بكر بن عمرو بن حزم	بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ
أن انظر ما كان من حديث	ﷺ کی حدیث اور سنت نیز حضرت
رسول الله ﷺ أو سنته أو	عمرؓ کی حدیثیں اور اسی قسم کی جو
حديث عمرؓ أو نحو هذا ،	روایات مل سکیں ان سب کو تلاش کر
فاكتبه لي، فإني خشيت دروس	کے مجھے لکھو کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے
العلم وذهاب العلماء''۳؎.	اور علماء کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حدیث

۱؎ صحیح بخاری باب کیف یقبض العلم ج۱ص۱۷ ۲؎ تہذیب التہذیب ج۱۲ص۴۳۹ ترجمہ ابوبکر بن حزم
۳؎ موطأ محمد باب اکتساب العلم وتہذیب التہذیب ج۱۲ص۳۹

وسنت کے ساتھ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے آثار کو بھی جمع کرنے کا حکم دیا تھا، مگر افسوس کہ قاضی صاحب کے کام کی ابھی تکمیل نہ ہوسکی تھی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۲۵/رجب ۱۰۱ھ میں رحلت فرما گئے، آپ کی مدت خلافت ۲ سال ۵ ماہ تھی، حافظ ابن عبدالبر مالکی ''التمہید'' میں امام مالکؒ کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ابن حزم نے متعدد کتابیں لکھیں قبل اس کے کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجیں، خلیفہ راشد وفات پا چکے تھے[۱]۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالخصوص اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:

انظروا إلىٰ حديث رسول الله ﷺ فاجمعوه[۲].	رسول اللہ ﷺ کی احادیث ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو۔

خلیفہ راشد کا یہ فرمان تو تمام ذمہ داروں کے نام تھا مگر خصوصیت سے ابوبکر بن حزمؒ کے علاوہ امام محمد بن شہاب الزہریؒ المتوفی ۱۲۵ھ کو بھی اس خدمت پر مامور کیا تھا، امام زہریؒ کا حال ان کے رفیق درس صالح بن کیسان سے سنئے، کہتے ہیں کہ ہم اور زہری دونوں طلب علم میں ساتھ تھے، زہری نے کہا کہ آ ؤ ہم سنتیں لکھیں، چنانچہ ہم نے لکھا جو کچھ کہ آنحضورؐ سے منقول ہے اور زہری نے آثار صحابہؓ کو بھی لکھا اور ہم نے نہیں لکھا وہ کامیاب ہوئے اور ہم ضائع[۳]، یہ امام موصوف کے دور طالب علمی کا حال تھا، خود عمر بن عبدالعزیز شہادت دیتے ہیں کہ:

---

[۱] مقدمہ تنویر الحوالک ص ۵ [۲] فتح الباری باب کیف یقبض العلم ج ۱ ص ۲۰۴

[۳] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸

لـم يبـق أحـد أعـلـم بسـنة ماضية من الزهري [1].	گذشتہ سنت کا زہری سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا۔

حافظ ابن عبدالبر ''جامع بیان العلم'' میں امام زہری کا بیان نقل کرتے ہیں:

''أمـرنـا عـمـر بن عبدالعزيز بـجمع السنن فكتبنا هادفترا دفترا فبعث إلى كل أرض له عليها سلطان دفترا'' [2].	ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے سنن کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت تھی ایک دفتر بھیج دیا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام موصوف نے قاضی ابوبکر بن حزم سے پہلے اس فن کی تدوین کر لی تھی، چنانچہ ان کی جمع کردہ کتابوں کو مختلف شہروں میں عمر بن عبدالعزیز نے بھیج دیا تھا اس لئے حافظ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں کہ اولیت کا سہرا امام زہری کے سر ہے، چنانچہ ''جامع بیان العلم'' میں امام مالک اور امام عبدالعزیز دراوردی دونوں کا قول نقل کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اس علم کے سب سے پہلے مدون ابن شہاب ہیں [3]، حافظ ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے فرماتے ہیں ''أول مـن دوّن الـحـديـث ابن شهـــــاب [4]'' علامہ سیوطی نے بھی محمد بن مسلم بن شہاب زہری کو پہلا مدون بتایا ہے [5]۔

محققین کی ایک جماعت نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، البتہ امام بخاری کا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۰۹ [2] جامع بیان العلم باب ذکر الرخصة في كتابة العلم ج۱ص۷۶
[3] حوالۂ مذکور [4] فتح الباری ج۱ص۲۰۸ [5] تدریب الراوی ج۱ص۹۰

رجحان قاضی ابوبکر بن حزم کی طرف ہے، جیسا کہ تعلیقاً ''صحیح بخاری'' میں مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہے، چونکہ تدوین کا کام مختلف علماء نے شروع کیا تھا اس لئے حدیث کا اول مدون مختلف حضرات کو کہا گیا ہے، مگر یہ اولیت کسی خاص شہر کے لحاظ سے ہو سکتی ہے، یا یہ حضرات ایک ایک باب کی احادیث جمع کرتے تھے، لیکن امام زہری کو مطلقاً (تمام بلاد اسلامیہ اور مختلف ابواب کی روایت جمع کرنے کے لحاظ سے) اولیت کا شرف حاصل ہے [۱]۔

ائمہ اربعہ اور تدوین حدیث | حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جمع و تدوین کا دروازہ کھولا اور آئندہ چل کر اس سلسلے کو بہت ترقی ہوئی، قاضی ابوبکر بن حزم اور امام زہری کے علاوہ مختلف ائمہ تابعین نے تصنیف و تالیف میں توجہ و دلچسپی لی، چنانچہ دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے، ابن جریج مکی المتوفی ۱۵۰ھ ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ سعید بن عروبہ المتوفی ۱۵۶ھ معمر یمنی المتوفی ۱۵۳ھ ربیع بن صبیح المتوفی ۱۶۰ھ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں [۲]، امام ابوحنیفہ المتوفی ۱۵۰ھ امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ امام احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ جو فقہ کے چار دبستان فکر کے مالک ہیں جن کی فقہ کی اس وقت تک عالم اسلام میں مقبول و زندہ ہے، یہ اللہ کا بڑا فضل اور اسلام کی اقبال مندی تھی کہ اس کارِ عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو وقت کے نئے حالات و مسائل سے آگاہ، اسلام کی تاریخ و روایات اور روحِ شریعت سے گہری واقفیت رکھتے تھے، عہد صحابہؓ اور اسلام کے پورے ذخیرے (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل

---

[۱] مقدمہ شرح قسطلانی ص ۱۷ [۲] تدریب الراوی ج ۱ ص ۸۹

عبور رکھتے تھے، ان ائمہ اربعہ کا تدوین حدیث میں بھی عظیم کارنامہ ہے، ''کتاب الآ ثار'' و''موطأ مالک'' یہ دونوں حدیث کی ایسی کتابیں ہیں جو پہلے فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کی گئیں۔

امام شافعی کی اگر چہ فن حدیث پر کوئی با قاعدہ تصنیف نہیں ہے مگر اس مقدس فن کی جو خدمت ان سے انجام پائی اس کو تاریخ تدوین حدیث میں فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور امام احمد کی ''مسند'' تو معروف ومشہور ہے۔

حافظ ابن تیمیہ ''کتاب الاستغاثۃ'' میں جو بکری کے رد میں تحریر فرمائی ہے، لکھتے ہیں ''ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو محدثین میں بھی امام ہیں اور فقہاء میں بھی اور ان دونوں جماعتوں میں شامل ہیں، گوان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے'' اس سے آگے یہ عبارت ہے:

وأكثر أئمة الحديث و الفقه	اورحدیث وفقہ کے اکثر امام جیسے کہ
كمالك والشافعي و أحمد	امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق بن
و إسحٰق بن راهويه و أبي	راہویہ ابوعبید اور اسی طرح اوزاعی،
عبيد و كذلك الأوزاعي و	ثوری اور لیث ایسے ہی تھے اور اسی
الثوري و الليث هؤلاء، و	طرح امام ابو یوسف صاحب امام
كذلك لأبي يوسف صاحب	ابی حنیفہ اور خود امام ابو حنیفہؒ کا بھی
أبي حنيفة ولأبي حنيفةأيضاً	وہی مرتبہ ہے جو ان کے شایان
ما له من ذلك، ولكن	ہے، لیکن ان میں بعض کو دونوں

لبعضهم في الإمامة في الصنفين ماليس للآخر، وفي بعضهم من ضعف المعرفة بأحد الصنفين ما ليس في الآخر، فرضي الله عن جميع أهل العلم والإيمان ۱؎.

صنف میں وہ مقام حاصل ہے کہ جو دوسرے کونہیں ہے اور بعض کو ایک صنف کی معرفت میں وہ ضعف بھی ہے کہ جو دوسرے میں نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ تمام اہل علم و ایمان سے راضی ہو۔

حافظ ابن تیمیہ نے بھی ائمہ اربعہ کو محدثین کا امام قرار دیا ہے ۲؎، اس لئے آئندہ صفحات میں ارباب ''صحاح ستہ'' کے ذکر سے پہلے ان کے حالات اور علم حدیث میں ان کی تصنیفات وخدمات پیش کی جارہی ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ان حضرات ائمہ نے اس مقدس فن کی خدمت کو کس طرح زیادہ علمی وترقی یافتہ شکل میں انجام دیا۔

۱؎ کتاب الاستغاثہ ص۲۴ ۲؎ دیکھئے منہاج السنۃ ۱/۱۰۵

امام اعظم ابوحنیفہؒ

نام ونسب نعمان نام، کنیت ابوحنیفہ، امام اعظم لقب، شجرۂ نسب یہ ہے، نعمان بن ثابت بن زوطی، عام طور پر امام صاحب کا عجمی النسل ہونا مسلم ہے خطیب بغدادی اور مؤرخ ابن خلکان نے امام صاحب کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے کہ ہم پر کبھی غلامی کا دور نہیں آیا، ہم لوگ فارسی نسل کے ہیں، ہمارے دادا امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، ثابت بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، انہوں نے ان کے اوران کے خاندان کے لئے دعا کی تھی، ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہ ہوئی [۱]، سن پیدائش کو ۶۱ھ بھی بتایا گیا ہے [۲]۔

سکونت کوفہ امام صاحب کا مولد ومسکن ہے جو اسلام کی وسعت وتمدن کا دیباچہ تھا علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں، حضور ﷺ کے بعد علم نبوت کے تین مراکز تھے، مکہ، مدینہ اور کوفہ، مکہ معظّمہ کے صدر مدرس حضرت ابن عباسؓ تھے اور مدینہ کے حضرت ابن عمرؓ اور کوفہ کے عبداللہ بن مسعودؓ تھے [۳]، حضرت علیؓ نے اس شہر کو دارالخلافہ بنایا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں كان أغلب قضاياه بالكوفه [۴]، حضرت علیؓ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوتے تھے، کوفہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے عہد فاروقی میں قرآن

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۱۰۷ [۲] مقدمہ اوجز المسالک ص۱۷۶
[۳] اعلام الموقعین ۳۵/۱ [۴] حجۃ اللہ البالغۃ ج اص۱۳۲

وسنت کا دار العلوم بن چکا تھا، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

و لـمـا ذهـب (عـلـيؓ) إلـى الكوفة كان أهل الكوفة قبل أن يـأتيهـم قـد أخذوا الدين عـن سـعـد بن أبي وقـاص و ابن مسعود و حذيفة و عمار و أبـي مـوسـىٰ وغيرهم ممن أرسله عمر إلى الكوفة۱.	جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے ہیں تو اہل کوفہ آپ کے وہاں آنے سے پیشتر حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت ابوموسیٰ وغیرہم سے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ روانہ کیا تھا، دین حاصل کر چکے تھے۔

صحابہ کرامؓ میں سے ایک ہزار پچاس حضرات جن میں چوبیس وہ بزرگ ہیں جو غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب رہے تھے، وہاں گئے اور سکونت اختیار کی۲۔

اور امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ عجلی (م ۲۶۱ھ) نے اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر اترے۳، علامہ نووی نے کوفہ کو دار الفضل والفضلاء کا لقب دیا ہے۴۔

تحصیل علم | امام صاحبؒ بیس سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے، سب سے پہلے ادب وانساب اور اس کے بعد خصوصاً علم کلام حاصل کیا، کچھ عرصہ کے بعد

---

۱ منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۵۷ ۲ فتح المغیث ص ۳۸۲

۳ تبییض الصحیفہ ص ۳۶ ۴ شرح مسلم باب القرأة في الظهر والعصر ج ۴ ص ۱۷۵

فقیہ وقت امام حماد کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے، حضرت حماد جو مشہور امام اور استاد وقت تھے، بڑے بڑے تابعین سے استفادہ کر چکے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث وفقہ کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا، اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا، حضرت حماد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا[۱]۔

امام صاحب نے اگر چہ مختلف اساتذہ سے فقہ وحدیث کی تحصیل کی ہے، لیکن خصوصیت سے حضرت حماد کے تربیت یافتہ ہیں، کوفہ میں کوئی محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہ نہ کیا ہو، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام صاحب کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے[۲]، علامہ سیوطی نے ''تبییض الصحیفہ'' اور کردری نے ''مناقب أبي حنیفہ'' میں امام صاحب کے بہت سے شیوخ واساتذہ کے نام گنائے ہیں اور مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے بھی ''التعلیق المجد'' میں بہت سے شیوخ کا تعارف کرایا ہے۔

امام صاحب کے شیوخ کی یہ خصوصیت ہے جیسا کہ علامہ شعرانی کہتے ہیں کہ امام صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کو خیار تابعین سے حاصل کیا ہے، جس کی سند میں کوئی بھی راوی متہم بالکذب نہیں ہے، اگر امام صاحب کے مسلک کے دلائل میں کوئی ضعف بیان کیا گیا ہے تو وہ مابعد کے رواۃ کے لحاظ سے ہے، امام صاحب کے شیوخ فقہ وحدیث دونوں کے جامع تھے[۳]۔

حرمین وغیرہ کا سفر | اس زمانے میں حج استفادہ وافادہ کا بڑا ذریعہ تھا، تمام

---

[۱] السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي ص ۱۰۴ ازمصفطیٰ سباعی

[۲] شرح سفر السعادۃ ماخوذ از مناقب الإمام الأعظم لصدر الأئمۃ ج۱/۳۷ [۳] کتاب المیزان ۱/۲۳۱

ممالک اسلامیہ کے گوشے گوشے سے اہل کمال آ کر جمع ہو جاتے تھے اور درس و افتاء کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، امام ابوالحسن مرغینانی نے بسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچپن حج کئے تھے [۱]، حرمین کے شیوخ میں سے عطاء بن رباح سے مکہ معظّمہ میں اور سالم بن عبداللہ اور سلیمان سے مدینہ طیبہ میں خصوصیت سے حدیثیں روایت کی ہیں، امام باقر کی خدمت میں ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے حاضر رہے [۲]، علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے لے کر منصور عباسی کے زمانۂ خلافت تک جو سات سال کا عرصہ ہوتا ہے، آپ کا مستقل طور پر قیام مکہ معظّمہ ہی میں رہا [۳]، بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ عراق و حجاز دونوں جگہوں کی روایات کو حاصل کیا۔

تلامذہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ کا احصاء دشوار ہے، واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ بعض ائمہ نے کہا ہے ائمہ اسلام میں اتنے شاگرد و تلامذہ کسی اور امام کے نہیں ہوئے، علامہ کردریؒ نے تین سو فقہاء و محدثین کو آپ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے، ابن حجر مکیؒ کہتے ہیں کہ جس طرح فقہاء میں امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ و امام زفرؒ و امام حسنؒ بن زیاد وغیرہ ہیں، اسی طرح محدثین میں عبداللہ بن مبارکؒ، لیث بن سعدؒ، امام مالکؒ اور مسعر بن کدامؒ اور صوفیاء میں فضیل بن عیاض، داود طائی جیسے ائمہ کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے [۴]، امام صاحب نے اپنے اصحاب و تلامذہ کی ایک مجلس مرتب کی تھی جس میں مختلف مسائل پیش کئے جاتے تھے، غور و فکر کے بعد جب کسی نتیجہ

---

[۱] مناقب الإمام از موفق ج ۱ ص ۲۳۱ [۲] اوجز المسالک ۱/۲۰۰

[۳] مناقب الإمام ج ۲ ص ۲۴ [۴] مقدمہ اوجز ۱/۲۰۰، ۲۰۱

پر سب لوگ متفق ہو جاتے تھے تو اس کو قلم بند کیا جاتا تھا، یہ مجلس چالیس ارکان پر مشتمل تھی [۱]۔

زہد وتقویٰ | عبداللہ بن مبارکؒ کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ پہونچ کر دریافت کیا کہ یہاں پر سب سے زیادہ پارسا کون ہے؟ تو لوگوں نے کہا ابوحنیفہؒ، خود انہیں کا بیان ہے میں نے امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر کسی کو پارسا نہیں دیکھا، حالانکہ مال ودولت سے ان کی آزمائش کی گئی تھی، زرنجری امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب حضرت ابوبکر صدیق کے افعال واقوال اور اخلاق اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، کیوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحابہ میں افضل اور علم وفقہ، پرہیزگاری اور سخاوت میں سب سے آگے تھے، اسی طرح امام صاحب تابعین کی جماعت میں ہیں [۲]۔

امام صاحب کی ایک اہم فضیلت | بخاری ومسلم اور ابونعیم نے حضرت ابوہریرہؓ سے طبرانی واحمد نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آنحضور ﷺ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لو كان العلم بالثريا لتناوله	اگر علم ثریا کے پاس ہو تو فارس کے
أناس من أبناء فارس [۳].	کچھ لوگ اس کو حاصل کرلیں گے۔

آپ کی اس پیشین گوئی کے اولیں مصداق علامہ سیوطی، ابن حجر مکی اور عام طور پر علماء نے امام ابوحنیفہؒ کو قرار دیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

---

[۱] حسن التقاضی از علامہ زاہد الکوثری ص ۱۷ [۲] مناقب أبی حنیفۃ ۱/۱۶۷، ۱۶۸

[۳] مسند إمام أحمد ج ۲ ص ۲۹۷

’’فقیر گفت امام ابوحنیفہ دریں حکم داخل است‘‘ ۱؎ ۔

فقیر یعنی شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ اس حکم میں داخل ہیں۔

ذکاوت وذہانت امام صاحب کی ذہانت وطباعی مشہور ہے، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں، ’’**كان من أذكياء بني آدم**‘‘یعنی اولاد آدم میں جوذکی گزرے ہیں، امام صاحب ان میں شمار کئے جاتے ہیں، امام صاحب کی ذہانت وفراست عقل کو سب نے تسلیم کیا ہے، محمد انصاری کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت حتی کہ بات چیت میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا، علی بن عاصم کا قول تھا کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلے میں اور دوسرے پلے میں حضرت امام ابوحنیفہ کی عقل رکھی جائے تو امام صاحب کا پلہ بھاری ہوگا۔ ۲؎

امام صاحب کا علمی مرتبہ امام وکیع فرماتے ہیں کہ میں کسی عالم سے نہیں ملا جو امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو ۳؎، نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ فقہ سے لوگ غافل تھے تو امام صاحب نے بیدار کیا، اس کو مرتب وملخص کیا، سفیان ثوری نے ایک شخص سے فرمایا جو امام صاحب کی مجلس سے واپس آیا تھا کہ ’’روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے واپس آرہے ہو، خارجہ بن مسیّب اور عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ علم وعقل میں امام ابوحنیفہؒ کی نظیر نہیں (علم سے مراد اس دور میں علم حدیث بھی ہوتا تھا) سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ اپنے زمانے کے عالم تھے اور اس کے بعد امام شعبی اپنے زمانے کے عالم ہوئے اور اس کے بعد امام ابوحنیفہ یعنی یہ تینوں اپنے اپنے دور میں بے مثال تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ

۱؎ کلمات طیبات ص ۱۶۸ ۲؎ مناقب أبي حنیفة ۱/۱۵۸ ۳؎ تہذیب الکمال ۲۹/۴۳۱

امام ابوحنیفہؒ کی نظیر میری آنکھوں نے نہیں دیکھی ۱؎، امام شافعی فرماتے تھے کہ جس کو فقہ کی معرفت منظور ہو وہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کو لازم پکڑے۔

امام صاحب کی تابعیت کی بحث امام صاحب کے آغاز شباب تک چند صحابہ کرامؓ زندہ تھے، جیسے حضرت انس بن مالک جو حضور ﷺ کے خادم خاص تھے، ۹۳ھ میں وفات پائی، ابوالطفیلؓ عامر بن واثلہ م۱۰۲ھ میں، عبداللہ بن بسر المازنی م۹۶ھ میں وفات پائی، بہرحال جمہور محدثین ومحققین کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ امام صاحب نے جن کی آنکھوں نے پیغمبر کا جمال دیکھا تھا ان کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کی تھیں، بعض حضرات نے امام صاحبؒ کی تابعیت کا انکار کیا ہے لیکن جمہور محدثین کا اس پر اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ کو بار بار دیکھا ہے، ابن حجر مکی اپنے ''فتاوی'' میں لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں کوفہ میں کئی صحابہ کرام جمع تھے، لہٰذا امام صاحبؒ کا طبقہ تابعین میں ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے یہ فضیلت دیگر ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوئی، جیسے امام مالک وامام اوزاعی وغیرہ۔

صاحب ''اِکمال'' بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب نے چھبیس صحابہ کرام کو دیکھا ہے، اس لئے تمام محدثین کبار مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ ذہبی، علامہ نووی، زین الدین عراقی، ابن جوزی، امام دارقطنی وغیرہ نے امام صاحب کی تابعیت کو تسلیم کیا ہے ۲؎۔

البتہ بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا امام صاحب کا کسی صحابی سے روایت کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے صحابہؓ سے امام صاحب کی روایات کا انکار کیا ہے،

۱؎ مناقب أبی حنیفہ از موفق ج ۱ ص ۳۲۱، ومقدمہ أوجز ج ۱ ص ۱۷۹ ۲؎ مقدمہ اوجز ص ۱۸۲

امام دارقطنی المتوفی ۳۸۵ھ نے کہا کہ:

لـم يـلـق أبـو حـنيفة أحداً من الـصـحـابة إلاأنـه رأى أنسـاً بعينه ولم يسمع منه ا.	ابو حنیفہؒ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی مگر حضرت انسؓ کا دیدار کیا ہے، لیکن ان سے سماع حاصل نہیں۔

خطیب بغدادی نے بھی امام دارقطنی سے پورا اتفاق کیا ہے، لکھتے ہیں: **لا يصح لأبي حـنيـفة سـمـا ع عن أنس بن مالک ۲**"اس لئے عام طور پر علماء نے انہیں کی تقلید کی ہے، تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر جیسے محقق نے بھی ان سے اختلاف نہیں کیا، حالانکہ "لسان المیز ان" میں ترجمہ عائشہ بنت عجرد کے تحت یحیٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

إن أبـا حـنيـفة صاحب الرأي سـمـع عـائشة بـنـت عجرد تـقـول: سـمـعـت رسول الله ﷺ أكثـر جند الله الجراد لا آكله ولا أحرمه ۳.	بیشک ابوحنیفہؒ صاحب الرائے نے حضرت عائشہ بنت عجرد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ روئے زمین پر اللہ کا بہت بڑا لشکر ٹڈیاں ہیں جس کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ حرام کہتا ہوں۔

یہاں امام صاحب کا حضرت عائشہ بنت عجرد سے سماع واضح طور پر ثابت ہے، ان

ا. تبییض الصحیفہ ص۵ ۲. تاریخ بغداد جلد۹ ص۱۱۱

۳. لسان المیز ان ج ۳ ص ۲۸۷ میں یہ عبارت سمعت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو جاتی ہے، حدیث کا متن کنز العمال سے نقل کیا گیا ہے۔

کے علاوہ متعدد صحابہ کرامؓ سے امام صاحب نے حدیثیں سنی ہیں، بظاہران کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے کیوں کہ امام مسلم کے نزدیک ایک معاصر اگر اپنے معاصر سے بطریق عنعنہ روایت کرے تو روایت متصل سمجھی جاتی ہے اورامام بخاریؒ کے نزدیک صرف ایک مرتبہ ملاقات کا ہوجانا بھی اتصال کے لئے کافی ہے،اس لئے دونوں کی شرطوں پرامام صاحب کا صحابہؓ سے روایت کرنا اتصال پرمحمول ہوگا،اس لئے عبدالقادر قرشی، ملاعلی قاری، حافظ بدرالدین عینی وغیرہ نے اس کوتسلیم کیا ہے۔

امام صاحبؒ اورامام مالکؒ خطیب بغدادی نے اپنی ''تاریخ''میں امام مالک کے بہت سے اقوال جرح امام صاحبؒ کے متعلق نقل کئے ہیں،مگر شارح ''موطأ'' أبوالولید باجی مالکی فرماتے ہیں کہ ان کا انتساب امام مالکؒ کی طرف صحیح نہیں ، بلکہ سعدی ، صمیری، موفق اور خوارزمی نے بیان کیا ہے کہ امام مالکؒ امام صاحبؒ کی کتابوں (یعنی ان کے تلامذہ کی کتابوں) سے استفادہ کرتے رہتے ہیں[۱]۔

بعض علماء نے جہاں امام مالک سے رواۃ کے سلسلہ میں ان کے بعض مشائخ کا نام لیا ہے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بھی تصریح کی ہے کہ یہ امام مالکؒ سے بھی روایت حدیث کرتے ہیں،حافظ ذہبی نے أشہب کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

رأيت أبا حنيفة بين يدي	میں نے ابوحنیفہ کو امام مالک کے
مالک كالصبيّ بين يدي	سامنے اس طرح دیکھا جس طرح
أبيه [۲].	بچہ اپنے باپ کے سامنے بیٹھتا ہے۔

اگرچہ امام صاحب کے لئے یہ بات کوئی عار کی نہیں ہے بلکہ یہ توغایت تواضع وانکسار

---

[۱] تأنیب الخطیب ص۱۶۹ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۲۰۹

کی دلیل ہے، امام صاحب نے تو اپنے تلامذہ تک سے حدیثیں روایت کی ہیں، مگر امام صاحب کا امام مالکؒ سے روایت کرنا محتاج ثبوت ہے، علامہ زاہد کوثری نے ''أقوم المسالک'' میں أشہب کی روایت کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

فما يرويه الذهبي في ترجمة مالک في ''طبقات الحفاظ'' عن أشهب لا يصح إلا إذا كان في حق حماد بن أبي حنيفة دون أبيه لأن ميلاد أشهب (١٤٥هـ) كما يقول ابن يونس، و مثله لا يمكن أن يرحل من مصر إلى المدينة المنورة، ويرى أبا حنيفة عند مالک أصلاً[1].

''طبقات الحفاظ'' میں امام مالک کے ترجمہ میں جو کچھ ذہبی اشہب سے نقل کرتے ہیں وہ صحیح نہیں البتہ یہ بیان حماد ابن ابی حنیفہ کے متعلق ہوسکتا ہے، کیوں کہ اشہب کا سن ولادت ۱۴۵ھ ہے جیسا کہ ابن یونس نے بیان کیا، اور اس عمر کے بچہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مصر سے سفر کر کے مدینہ منورہ جائے اور امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے یہاں دیکھ سکے۔

یہ یاد رہے کہ امام صاحبؒ کا سن وفات ۱۵۰ھ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رقم طراز ہیں:

إن ابا حنيفة لم تثبت روايته عن مالک، و إنما أورده الدار قطني ثم الخطيب في

بیشک امام ابوحنیفہ کا امام مالک سے روایت کرنا ثابت نہیں ہے، دار قطنی اوران کے بعد خطیب نے امام مالک

---

[1] اقوم المسالک ص ۷

الرواة عنه لروايتين وقعتا	کے رواۃ میں صرف دو روایتوں کی
لهما بإسنادين فيهما مقال ،	وجہ سے امام ابوحنیفہ کا شمار کیا ہے اور
وهما لم يلتزما في كتابيهما	دونوں کی صحت میں کلام ہے، خود
الصحة ا۔	دارقطنی اور خطیب نے اپنی کتابوں
	میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے۔

مآخذ علم خطیب بغدادی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ امیر المؤمنین ابوجعفر نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا؟ تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں سے علم حاصل کیا ۲۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی کی بنیاد عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاوے، حضرت علیؓ کے فیصلے وفتاوے اور قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فتاوے پر ہے امام ابوحنیفہؒ نے ان حضرات کے آثار کو سامنے رکھ کر استنباط واستخراج مسائل کیا، نیز امام ابوحنیفہ ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کے مسلک سے بہت کم انحراف کرتے تھے، ابراہیم نخعی کے مذہب پر تخریج مسائل میں امام صاحبؒ کو بڑا ملکہ حاصل تھا، فروعی مسائل کی تخریج میں بہت دقیق النظر واقع ہوئے تھے، اگر تم ہمارے قول کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو ابراہیم نخعی کے اقوال ''کتاب الآثار لمحمد'' اور ''جامع عبدالرزاق'' و''مصنف ابوبکر بن شیبہ'' سے نکال لو اور ملا کر دیکھو، شاید ہی کسی جگہ اختلاف پاؤ گے اور اگر کسی جگہ اختلاف ہے تو فقہائے کوفہ کے خلاف نہ پاؤ گے ۳۔

ا۔ تدریب ص ۳۴ ۲۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۴ ۳۔ الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف ص ۳۷

امام صاحبؒ نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحبؒ نے جس قدر مسائل مدون کئے ہیں، ان کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد ہے [۱]۔

امام صاحب کی وفات خاندان نبوت میں واقعہ کربلا کے بعد متعدد افراد نے انقلاب حکومت کی کوشش کی، محمد ذوالنفس الذکیہ نے مدینہ طیبہ میں اوران کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، امام صاحبؒ نے برملا ان کی تائید کی، مشہور ہے کہ منصور نے امام صاحب کے سامنے منصب قضا کی پیشکش کی تھی مگر امام صاحبؒ نے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں منصور نے ۱۴۷ھ میں قید کرا دیا، مؤرخین کا خیال ہے کہ منصور نے ان کے خلاف جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ محمد وابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، بہرحال بے خبری میں منصور نے آپ کو زہر دلوا دیا، جب اس کا اثر امام صاحب نے محسوس کیا تو سجدہ کیا اوراسی حالت میں رجب ۱۵۰ھ میں قضا کی [۲]، إنا لله و إنا إليه راجعون، اولاد میں صرف ایک صاحبزادے حماد تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کا علم حدیث میں مقام مشہور ہے کہ امام صاحب کی فن حدیث میں کوئی تصنیف نہیں ہے اور ''صحاح ستہ'' میں بجز ایک دو جگہ کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا، سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث سے امام صاحبؒ کو تعلق کم تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ کچھ دانستہ اور نادانستہ طور پر یہ ایسی غلط فہمی ہے کہ جس کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہے حضرت شاہ ولی

---

[۱] النکت الطریفہ ص ۱۵۱ از کوثری [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۱۰۷

اللہ صاحبؒ اور علماء محققین نے مجتہد کی تعریف یہ کی ہے کہ مجتہد وہی شخص ہوسکتا ہے جو قرآن، حدیث، آثار، تاریخ، لغت وقیاس ان پانچ چیزوں پر کافی عبور رکھتا ہو[1]۔

امام صاحبؒ کے مجتہد مطلق ہونے پر امت کا اجماع ہے، اس کے بعد ان پر قلت حدیث کا طعن نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، اس لئے ہم ائمہ حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں تا کہ حقیقت آشکارا ہو جائے، حافظ ذہبی نے مسعر بن کدام جو امام صاحبؒ کے عہد طالب علمی کے رفیق رہ چکے ہیں، ان کا بیان نقل کیا ہے:

طلبت مع أبي حنيفة الحديث فغلبنا، وأخذنا في الزهد فبرع علينا، وطلبنا معه الفقه فجاء منه ما ترون[2].	میں نے اور امام ابوحنیفہ نے ساتھ ساتھ علم حدیث حاصل کیا، تو وہ ہم پر غالب رہے اور زہد میں بھی وہ ہم پر فائق رہے فقہ ان کے ساتھ شروع کی، تو تم دیکھتے ہو کہ کیا کمال ان سے ظاہر ہوا۔

یحیٰ بن سعید قطان جو جرح وتعدیل کے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں:

إنه والله لأعلم هذه الامة بما جاء عن الله ورسوله[3].	واللہ امام ابوحنیفہ اس امت میں خدا ورسولؐ سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

مکی بن ابراہیم نے امام صاحبؒ کو اعلم اہل زمانہ بتایا ہے[4]۔

---

[1] عقد الجید ص ۵ — [2] مناقب أبی حنیفہ ص ۲۷/از ذہبی
[3] ماتمس إلیہ الحاجۃ ص ۳۹ — [4] مقدمہ أوجز ص ۱۸۴

ابوالمحاسن شافعی نے اپنی کتاب ''عقود الجمان'' (ص۳۱۹) میں مستقل ایک باب قائم کیا ہے جس میں امام صاحبؒ کی روایت حدیث کی کثرت اور ان کا اعیان حفاظ حدیث میں ہونا بیان کیا ہے امام ابوحنیفہ بایں وسعت نظر ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ کوفہ میں جب بھی کوئی محدث آتا تو اس سے استفادہ کرتے، امام صاحبؒ کے مشہور شاگرد محدث عبدالعزیز بن رِزمہ کے بیان کو علامہ موفق نے بسند نقل کیا ہے:

وذكر علم أبي حنيفة بالحديث فقال: قدم الكوفة محدث، فقال أبو حنيفة لأصحابه: انظروا هل عنده شيء في الحديث ليس عندنا؟ قال: وقدم علينا محدث آخر فقال لأصحابه مثل ذلک[۱].

عبدالعزیز بن رِزمہ نے امام ابوحنیفہ کے علم حدیث کا تذکرہ کیا اور اس سلسلے میں یہ بتایا کہ ایک بار کوفہ میں ایک محدث آئے تو امام ابوحنیفہؒ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے، دیکھو تو ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہ ہو، عبدالعزیز کا بیان ہے کہ دو بارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے جب بھی آپ نے اپنے اصحاب سے یہی فرمایا۔

امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے، جن میں دو ہزار حماد کی حدیثیں تھیں اور دو ہزار بقیہ دیگر مشائخ کی[۲]۔

---

[۱] مناقب الإمام الأعظم ۱/۵۷، ۶ ۷/ازصدرالأئمہ مکی

[۲] مناقب الإمام الأعظم ۱/۵۷، ۶ ۷/ازموفق بن مکی

صاحب ''عقود الجمان'' لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے روایات کی قلت کی وجہ حفظ حدیث کی وسعت کے باوجود استنباط مسائل سے اشتغال ہے، اور اسی طرح مالک وشافعی سے ان کی مسموعات کی بہ نسبت کم روایات منقول ہیں، جیسے صحابہؓ میں حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ سے ان کی معلومات کی کثرت کے باوجود دیگر صحابہؓ کے مقابل میں کم روایات پائی جاتی ہیں [۱]۔

روایت حدیث میں احتیاط امام صاحبؒ روایت حدیث میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے، جس کا اعتراف بڑے بڑے محدثین تک کو ہے، یحییٰ بن معین کا قول ہے:

كان أبو حنيفة ثقة لا يحدث إلا ما يحفظ، ولا يحدث بما لا يحفظ [۲].

امام صاحب ثقہ ہیں جو حدیث ان کو حفظ ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں جو یاد نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے۔

امام صاحب کی اس احتیاط کا اندازہ امام وکیع کی اس شہادت سے ہوتا ہے، جو انہوں نے دی ہے، فرماتے ہیں کہ جیسی احتیاط امام صاحب سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی [۳]۔

امام صاحب کے شرائط امام صاحبؒ کو ایک دوسری حیثیت سے بھی اپنے معاصرین اور بعد کے ائمہ پر خصوصیت حاصل ہے، امام صاحبؒ کے زمانے تک بہت سے احادیث کے دفتر تیار ہو چکے تھے، لیکن ضرورت تھی کہ احادیث کے قبول ورَد

---

[۱] مقدمہ أوجز المسالک ص۹۶ جدید
[۲] تاریخ بغداد ج۱۳ ص۴۱۹ وتہذیب التہذیب ۶۳۰/۵
[۳] مناقب الإمام از موفق ج۲ ص۱۹۷

کے قاعدے مرتب کئے جائیں، چنانچہ امام صاحبؒ نے اس کی بنیاد ڈالی اور بہ لحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق کی، ان کے اصول تنقید بہت سخت تھے، اس لئے متشدد فی الروایۃ کا لقب دیا گیا[۱]۔

امام صاحبؒ کے قلیل الروایۃ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

والإمام أبو حنفية إنما قلت روايته لما شدد في شرط الرواية والتحمل.	یعنی امام ابو حنیفہؒ سے روایت کم ہے اس لئے کہ انہوں نے روایت اور تحمّل کی شرط میں سختی کی ہے۔

وہ شرائط کیا ہیں؟ امام طحاوی نقل کرتے ہیں:

حدثنا سليمان بن شعيب حدثنا أبي أملا علينا أبو يوسف قال: قال أبو حنيفة: لا ينبغي للرجل أن يحدث من الحديث إلا بما حفظه من يوم سمع إلى يوم يحدث[۲].	یعنی امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں بیان کرنا چاہیئے جب تک کہ سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔

امام صاحبؒ کا عمل اسی اصول پر تھا، چنانچہ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں:

وقد كان الإمام أبو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن رسول الله ﷺ	جو حدیث حضور ﷺ سے منقول ہو، اس کے متعلق امام صاحب عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس

[۱] اصول السرخسی ج ۱ ص ۲۶۴ [۲] الجواہر المضیئۃ (ترجمہ امام ابوحنیفہ) ۱/۶۱

قبل العمل به أن يرويه عن ذلک الصحابيؓ جمع أتقياء عن مثلهم و هکذا[1].	کو متقی لوگوں کی ایک جماعت اس صحابی سے مسلسل نقل کرتی چلی آئی ہو۔

عمل بالحدیث کی جس شرط کا علامہ شعرانی نے تذکرہ فرمایا ہے، اس کو علامہ ذہبی نے خود امام صاحب سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

آخذ بکتاب الله، فمالم أجد فبسنة رسول الله والآثار الصحاح عنه التی فشت في أيدي الثقات عن الثقات، فإن لم أجد فبقول أصحابه، آخذ بقول من شئت، و أما إذا انتهى الأمر إلى إبراهيم و الشعبي والحسن و عطاء فأجتهد کما اجتهدوا[2].	میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں، پھر اگر یہاں نہ مل سکے تو آپؐ کے صحابہ میں سے جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی و شعبی، حسن و عطا تک پہونچ جاتا ہے تو پھر اجتہاد سے کام لیتا ہوں جیسا کہ ان حضرات نے اجتہاد کیا۔

امام صاحبؒ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ صرف ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو صحیح ہیں اور جن کی اشاعت ثقات کے ذریعہ سے ہوئی ہے، علامہ سیوطی کو بھی اعتراف ہے کہ ''صحیحین'' کے سب رواۃ بھی اس معیار پر کامل طور سے نہیں اتر

---

[1] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۲۲۷ [2] مناقب أبی حنیفہ ص ۲۰ از ذہبی

سکتے، فرماتے ہیں کہ:

هـذا مـذهب شديد قد استقر العـمـل عـلىٰ خلافـه، فلعل الرواة في "الصحيحين" ممّن يـوصف بـالـحـفظ لا يبلغون النصف ۱؎.	یہ سخت مذہب ہے اور عمل اس کے خلاف قرار پایا ہے، کیوں کہ غالبًا "صحیحین" کے ان رواۃ کی تعداد جو حفظ سے موصوف ہیں نصف تک نہیں پہونچتی۔

امام صاحبؒ کا یہ طرز عمل قابل قبول تھا، مگر بعض محدثین جن کا عمل ظاہر حدیث پر ہے بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحبؒ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

كثيـر مـن أهـل الـحـديـث قد استـجـازوا الـطـعـن على أبي حـنيـفة لـرده كثيراً من الأخبار الآحـاد لـلـعـدول، لأنـه كـان يـذهـب في ذلک إلى عرضها عـلـى مـا اجتـمـع عـلـيـه مـن الأحـاديث و معاني القرآن فما شـذ مـن ذلـک رده و سـمـاه شاذا ۲؎.	بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہؒ پر اس لئے طعن کیا ہے کہ انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا اصل بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث و قرآن سے ملا کر دیکھتے تھے، اگر اس کا مضمون ان سے مطابقت کھاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث سمجھتے۔

امام صاحبؒ کے ان شرائط واحتیاط کی وجہ سے جن روایات سے وہ استدلال کرتے

۱؎ تدریب الراوی ص۱۶۰ ۔ ۲؎ الموافقات ج۳ص۲۴

ہیں وہ صحت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام پر ہوتی ہیں، علی بن جعد جوہری جو امام بخاری اور امام ابوداود کے استاد ہیں، بیان کرتے ہیں کہ:

أبو حنيفة إذا جاء بالحديث جاء بمثل الدر [۱].	امام اعظمؒ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ موتی کی طرح چمکتی ہوتی ہے۔

اس کا صحیح اندازہ امام صاحبؒ کی ''مسانید'' بالخصوص ''کتاب الآثار'' اور صاحب ''قاموس'' علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کی کتاب **''عقود الجواهر المنيفة في أدلة الإمام أبي حنيفه''** اور علامہ عابد سندی کی کتاب جو زیادہ مفصل ہے، اس کا نام **''المواهب اللطيفة في شرح مسند الإمام أبي حنيفة''** ہے عنقریب ہماری تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۸؍جلدوں میں شائع ہو رہی ہے، سے لگایا جاسکتا ہے۔

امام صاحبؒ پر ایک بے بنیاد الزام امام صاحبؒ نے قیاس واجتہاد کی جو دقیق راہ کھولی تھی، اس کی بنا پر عوام محدثین جو ظاہر حدیث ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور جدید مسائل میں غور وخوض کو معیوب سمجھتے تھے انہوں نے امام صاحبؒ پر یہ الزام لگایا کہ امام صاحب قیاس کے مقابلے میں حدیث کو قبول نہیں کرتے (معاذ اللہ) مگر امام صاحبؒ سے جو اقوال منقول ہیں وہ خود اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں امام صاحبؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ بات جس کے ذریعہ حضور ﷺ نے کلام فرمایا، ہم نے سنا ہو یا نہ سنا ہو بسر وچشم قبول ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایسی ہے جیسا کہ آپؐ نے فرمایا ہے [۲]۔

---

[۱] جامع مسانید الإمام الأعظم از محدث خوارزمی ج۲ص۳۰۸ [۲] تأنیب الخطیب ص۸۶

حافظ ابن عبد البر مالکی نے ''الانتقاء'' میں امام صاحب سے یہ روایت بیان کی ہے:

لعن الله من يخالف رسول الله ﷺ، به أكرمنا الله وبه استنقذنا ۱؎.	یعنی اللہ کی لعنت ہو اس پر جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتا ہے، آپ ہی کے ذریعہ ہمیں اللہ نے عزت بخشی اور آپ ہی کے ذریعہ ہمیں (کفر وشرک سے) بچایا۔

علامہ شعرانی نے ''میزان'' میں امام صاحبؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا، واللہ ہم پر جھوٹ وافتراء ہے جو شخص یہ الزام لگاتا ہے کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت ہوگی؟

البتہ تابعین کے متعلق امام صاحبؒ فرماتے تھے ''**هم رجال ونحن رجال** ۲؎'' کیوں کہ امام صاحبؒ بھی تابعی ہیں۔

امام محمد نے ''المبسوط'' میں بالتفصیل لکھا ہے کہ امام صاحبؒ حدیث صحیح کے مقابل میں کسی بھی رائے کا اعتبار نہیں کرتے تھے، بلکہ علامہ ابن حزم نے فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔

ایسے ہی حافظ ابن قیم ''إعلام الموقعین'' میں لکھتے ہیں کہ ''**أن ضعيف الحديث عنده (أي أبي حنيفةؒ) أولىٰ من القياس**'' اور اس کی بکثرت مثالیں مذہب حنفی میں موجود ہیں، حدیث وضوء بالقہقہہ فی الصلوٰۃ، حدیث وضوء بنبیذ التمر وغیرہ کو باوجود ضعیف ہونے کے امام صاحبؒ نے قیاس پر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:

۱؎ السنۃ ومکانتہا از مصطفیٰ السباعی ص ۴۰۷ ۲؎ المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۶۱

فتقديم الحديث الضعيف و آثار الصحابة على القياس والرأي قوله (أي قول الإمام أبي حنيفة) وأحمد.
یعنی امام ابوحنیفہ وامام احمد دونوں کے نزدیک حدیث ضعیف وآثار صحابہ کو قیاس ورائے پر مقدم رکھا گیا ہے۔

البتہ حدیث ضعیف کی تعریف میں علماء سلف ومتأخرین کا اختلاف ہے، متأخرین جس حدیث کو حسن کہتے ہیں اُس کو متقدمین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے تھے[۱]۔

علامہ ابن حزم و حافظ ابن قیم ان دونوں نے امام صاحبؒ کے مسلک پر بکثرت تنقیدیں کی ہیں مگر انہیں بھی اعتراف ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے، حدیث مرسل کو قبول کرنا اور قیاس ورائے پر مقدم کرنا حنفیہ کا مشہور ومعروف ضابطہ ہے، حالانکہ امام شافعیؒ نے اس کو قبول کرنے کے لئے شرائط مقرر کئے ہیں اور محدثین کی ایک جماعت نے بالکل ہی ترک کردیا۔

امام اعظم اور فن جرح وتعدیل اگرچہ اس فن کا آغاز دورِ صحابہؓ وتابعین میں ہو چکا تھا مگر تابعین کے دورِ اخیر میں باقاعدہ اس فن کی ابتدا ہوئی، حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب قریب تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق وتضعیف کے لئے زبان کھولی، امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ:

ما رأيت أكذب من جابر الجعفي.
میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا[۲]۔

امام ترمذی نے بھی اس کو "کتاب العلل" میں نقل کیا ہے۔

---

[۱] السنۃ ومکانتہا ص ۴۷۰ [۲] فتح المغیث ص ۴۷۹ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ناچیز کی کتاب "فن اسماء الرجال"

مسانید امام اعظمؒ | امام صاحبؒ کی متعدد تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان کے حالات کے ساتھ مذکور ہیں، مگر ہمیں یہ بتانا ہے کہ آیا فن حدیث پر کوئی مجموعہ موجود ہے یا نہیں؟ عام طور پر غلط فہمی ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے جس طرح فقہ کو با قاعدہ مرتب و مدون کرایا اس کو امام صاحب کے تلامذہ بالخصوص قاضی ابو یوسف و امام محمد نے اپنی تصانیف میں جمع کر دیا ہے، امام شافعیؒ نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

الناس عيال في الفقه على أبي حنيفة. [۱]	سب کے سب آنے والے فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے خوشہ چیں ہیں۔

اسی طرح حدیث کا سرمایہ جو منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا، اس کو بھی با قاعدہ فقہی ترتیب پر مرتب کرایا، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

من مناقب أبي حنيفة التي انفرد بها أنه أول من دون علم الشريعة و رتبه أبوابا، ثم تبعه مالك بن أنس في ترتيب "الموطأ" ولم يسبق أبا حنيفة أحد [۲].	امام ابوحنیفہؒ کے ان مناقب خصوصی میں سے جن میں وہ منفرد ہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کو مدون کیا اور ان کو ابواب پر ترتیب دیا، پھر امام مالکؒ نے ''موطأ'' کی ترتیب میں انہیں کی پیروی کی اور اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۶۸ ۲۔ تبییض الصحیفۃ ص ۱۲۹

علامہ کوثری نے ان مسانید کی تعداد اکیس بتائی ہے اور فرماتے ہیں کہ ان سب کی اسانید متصل ہیں، ان مسانید کو امام صاحبؒ کے تلامذہ نے جمع کیا تھا، محدث خوارزمی المتوفی ٦٦٥ھ جو ان مسانید کے جامع ہیں ابتداء کتاب میں لکھتے ہیں:

''میں نے شام کے بعض جاہلوں سے سنا کہ وہ امام اعظم کی تنقیص کرتے ہیں اور ان پر قلت روایت حدیث کا الزام لگاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ''مسند'' شافعیؒ اور ''موطأ'' مالک تو مشہور ہیں، مگر امام ابو حنیفہ کی کوئی مسند نہیں، بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صرف چند احادیث کی روایت پر اکتفا کیا ہے، اس لئے میری دینی حمیت نے آمادہ کیا کہ امام صاحبؒ کی ان پندرہ مسانید کو یکجا جمع کردوں جن کو بڑے بڑے علماء حدیث نے جمع کیا ہے''۔[۱]

ان جامعین کے حالات بھی خوارزمی نے بیان کر دیے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) امام صاحبؒ کے صاحبزادے حماد کی ''مسند''۔

(۲) اما ابو یوسفؒ کی ''کتاب الآثار''۔

(۳) ''مسند'' حسن بن زیاد لؤلوی۔

(۴) امام محمد کی ''کتاب الآثار''۔

ان حضرات نے براہ راست امام صاحبؒ سے روایت کی ہے۔

(۵) ''مسند'' حافظ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب حارثی بخاری جو عبداللہ الاستاد

---

[۱] تبییض الصحیفۃ ۱۸۲، ۱۸۳

کے لقب سے مشہور ہیں اور ابو حفص کبیر کے شاگرد ہیں۔

(۶) ''مسند'' حافظ أبو نعیم أحمد بن عبداللہ الاصبہانی صاحبِ کتاب ''الحلیہ''۔

(۷) ''مسند'' أبوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر۔

(۸) ''مسند'' حافظ أبو أحمد عبداللہ بن عدی بن جرجانی۔

(۹) ''مسند'' عمرو بن حسن أشنانی۔

(۱۰) ''مسند'' أبوالحسین محمد بن جعفر

ان چھ حضرات کا شمار حفاظ حدیث میں ہے۔

(۱۱) ''مسند'' ابوبکر احمد بن محمد کلاعی۔

(۱۲) ''مسند'' حافظ ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری۔

(۱۳) ''مسند'' حافظ سعدی۔

(۱۴) ''مسند'' حسین بن محمد خسروی

(۱۵) ''مسند'' موسیٰ بن زکریا حصفکی، ان کی ''مسند'' کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

ان مسانید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر روایات صرف دو واسطے سے آنحضرت ﷺ تک پہونچتی ہیں، اس سے اس کی صحت وقوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ائمہ اربعہ میں صرف امام مالکؒ اس خصوصیت میں شریک ہیں، مگر ان کی مرویات میں سب سے عالی یہی روایات ہیں جب کہ امام اعظمؒ کی مرویات میں وحدانیات بھی موجود ہیں۔

علامہ شعرانی نے بڑے فخر ومسرت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں امام اعظم کی مسانید ثلاثہ کے صحیح نسخوں کی زیارت ومطالعہ سے مشرف ہوا، جن پر حفاظ حدیث کے دستخط تھے [۱]، علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ خطیب بغدادی امام صاحب کے مسانید

---

[۱] مقدمہ أوجز المسالک ص ۹۴

کوسفر وحضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے ا۔

اگر چہ امام صاحبؒ کے فقہی مسائل کے مقابلے میں ان کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی مگر واقعہ ہے کہ بعد والوں کے لئے بہت بڑا نمونہ چھوڑ گئے۔

محدث خوارزمی نے ان کو مسانید کے نام سے موسوم کیا ہے، اس لئے بعد کے علماء بھی ان کو مسند کہنے لگے، مگر بہت سے اہل علم نے ''کتاب الآ ثار والسنن'' کے نام سے بھی یاد کیا بلکہ قاضی ابو یوسف کی مسند ''کتاب الآ ثار'' کے نام سے چھپ بھی گئی ہے، امام محمد کی مسند تو ''کتاب الآ ثار'' کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی نے بھی اس کو ''بدائع الصنائع'' میں ''ذکر آ ثار أبي حنيفة'' ہی کے نام سے یاد کیا ہے ۲۔

''کتاب الآ ثار'' لمحمد کے متعلق حافظ ابن حجر ''تعجیل المنفعة'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

والموجود من حديث أبي حنيفة مفرداً إنما هو "كتاب الآثار" التي رواها محمد بن الحسن عنه.	امام ابوحنیفہ کی حدیث میں مستقل طور پر جو کتاب موجود ہے وہ ''کتاب الآ ثار'' ہے جس کو امام محمد نے ان سے روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ قاسم بن قطلو بغا نے اس کے رجال پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، حافظ ابن حجرؒ کی کتاب کا نام "الإيثار بمعرفة الآثار" ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين-

ا۔ تأنیب الخطیب ص۴ و کتاب الممیز ان ج اص ۲۳۱

۲۔ بدائع الصنائع ج اص ۱۳۰

امام مالکؒ

نام ونسب و ولادت | مالک نام،کنیت ابوعبداللہ،امام دارالہجرۃ لقب، باپ کا نام انس تھا،سلسلۂ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث بن غیمان بن خُثَیل بن عمرو بن الحارث ذی اصبح ۱؎ ،امام مالک خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت واسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا،سب سے پہلے ان کے پردادا ابو عامر نے مدینۃ النبیؐ میں آ کر سکونت اختیار کی، چونکہ یمن کے خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ اصبح سے تعلق رکھتے تھے،امام صاحب کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے،اس لئے ذا اصبح کے لقب سے وہ مشہور ہیں ۲؎ ۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر مشرف باسلام ہوئے، قاضی ابوبکر بن علاء قشیری نے ان کو جلیل القدر صحابی بتایا ہے،مگر محدثین کے نزدیک یہ ثابت نہیں محدث ذہبی فرماتے ہیں: "**لم أر أحداً ذَكَرهُ في الصحابة**" حافظ ابن حجر نے "الإصابہ" میں ذہبی کی عبارت نقل کردی ۳؎ ،اس سے ثابت ہوا کہ ان کو آنحضرت ﷺ سے شرف لقاء ثابت نہیں،البتہ امام صاحب کے دادا

۱؎ تذکرہ ج ۱ص ۲۰۷ ووفیات الأعیان ج ۴ص ۱۳۵، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ص ۱۷۷

۲؎ ترتیب المدارک ج ۱ص ۱۰۹، ومقدمہ تنویر الحوالک

۳؎ تجرید أسماء الصحابۃ ۲/ ۱۸۲، والإصابه في تمييز الصحابة ج ۴ص ۷۷۹

مالک جلیل القدر تابعی اور ''صحاح ستہ'' کے رواۃ میں ہیں، مالک بن عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالکؒ کے والد بزرگوار، ربیع وابوسہیل نافع، نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، صحیح ومعتبر روایت کی بنا پر امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ ہے [۱]۔

مدینہ طیبہ امام مالکؒ کے خاندان کو جس طرح دینی وعلمی لحاظ سے ایک ممتاز مقام تھا، اسی طرح آپ کا مولد ومسکن مدینۃ الرسولؐ علماء وفضلاء کا مخزن تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہؓ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے۔

عہد نبویؐ سے لے کر حضرت علیؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک ساری دنیائے اسلام کا مرکز یہی تھا، بعد کو دارالخلافہ کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہونے کے بعد اس کی علمی وہ حیثیت باقی نہیں رہی، تاہم امام مالکؒ کے زمانے تک اس کا امتیاز مسلم تھا، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

باید دانست کہ مدینہ مشرفہ در زمان او پیشتر از زمان متاخر بلاشبہہ مرجع فضلاء ومحط رجال علماء بودہ است'' [۲]۔

جاننا چاہئے کہ مدینہ شریف امام مالکؒ کے زمانے میں اخیر دور سے پہلے بلا شبہہ فضلاء کا مرجع اور اہل علم کی فرودگاہ تھا۔

البتہ امام مالکؒ کے طبقے کے بعد وہاں علمی انحطاط آ گیا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

ثم تناقص العلم جدا بها في الطبقة التي بعدهم ثم تلاشى [۳].	پھر ان کے بعد والے طبقے میں وہاں علم بہت ہی کم ہو گیا اور اس کے بعد تو بالکل جاتا رہا۔

---

[۱] ماخوذ از مقدمہ شرح موطأ اززرقانی وتذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۱۲

[۲] مصفی شرح موطأ ج ا ص ٦ [۳] امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۳۰

لیکن امام مالکؒ کے زمانے تک مدینہ منورہ کی فضا علم ودین سے معمور تھی، امام مالکؒ کو اپنے یہاں کے علماء پر اتنا وثوق تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ مستقل حجت ہے ؎۔

تحصیل علم | امام صاحبؒ نے آنکھ کھولی تو مدینہ باغ و بہار تھا، ان کا گھر خود علوم کا مرجع تھا، انہوں نے قرآن مجید کی قرأت وسند مدینہ کے امام القراء نافع بن عبدالرحمٰن المتوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی، جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی بنیاد ہے، امام صاحب حدیث کی تحصیل کے وقت کم عمر تھے، خود فرماتے ہیں:

کنت آتي نافعا وأنا غلام حديث السن ۱؎.

میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کم سن لڑکا تھا۔

نافع حضرت ابن عمرؓ کے غلام ہیں جو حدیث و درایت کے استاد وشیخ تھے، انہوں نے کامل تیس (۳۰) برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ اور دیگر صحابہؓ سے بھی روایت کی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی ۲؎۔

حضرت نافع جب تک زندہ رہے امام مالکؒ ان کے حلقۂ درس میں موجود رہے، محدثین روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) قرار دیتے ہیں ۳؎۔

نافع کے علاوہ امام صاحب نے دیگر شیوخ سے بھی حدیث سیکھی تھی، امام مالکؒ نے طلب علم کے لئے مدینہ سے باہر قدم نہ نکالا، کیوں کہ اس وقت مدینہ دارالعلم تھا اور تمام ممالک اسلامیہ کے شیوخ واساتذہ خود آستانۂ نبویؐ پر حاضر ہوتے تھے۔

؎ حافظ ابن قیم نے ''اِعلام المواقعین'' (۲۹۸/۱) میں عمل اہل مدینہ پر جو بحث کی ہے وہ قابل دید ہے۔

۱؎ تذکرہ ج۱ص ۸۸ ۲؎ حسن المحاضرہ ص۱۶۶ ۳؎ البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۱۷۴

شیوخ واساتذہ امام مالکؒ نے صرف انہیں شیوخ سے استفادہ کیا جوصدق و طہارت میں معروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے، امام صاحب نے جن شیوخ سے ''موطأ'' میں روایت کی ہےان کی تعداد پچانوے ہے، یہ سب اساتذہ مدنی ہیں،اس طرح مدینہ کا جوعلم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا، وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا،اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا،ان کے شیوخ میں صرف چھ حضرات غیرمدنی ہیں یہ صرف ''موطأ'' کے شیوخ کی تعداد ہے، ورنہ علامہ زرقانی نے نوسو سے زائدان کی تعداد بتائی ہے[۱]۔

امام مالکؒ جس شیخ سے روایت کرتے ہیں وہ ثقاہت وعدالت وحفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، احمد بن حنبل سے کسی شخص نے ایک راوی کی نسبت پوچھا،انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیوں کہ امام مالکؒ نے اس سے روایت کی ہے[۲]۔

امام مالکؒ فطرۃً قوی الحافظہ تھے،خودفرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آکرپھر نہ نکلی[۳]۔

''موطأ'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی بہت کم روایات ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ تحریرفرماتے ہیں کہ ہارون رشید نے امام صاحبؒ سے اس کا سبب دریافت کیا توفرمانے لگے کہ:

---

[۱] مقدمہ زرقانی ص۲ومقدمہ اوجزالمسالک [۲] اسعاف المبطأ فی رجال الموطأ ص۴
[۳] الدیباج المذہب ۱/۱۰۰

لم یکونا ببلدي ولم ألق رجالهما.[۱]	یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہ ہوسکی۔

اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات ان دونوں حضرات سے بھی کم ہیں۔

مجلس درس | مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے بعد ان کی علمی درسگاہ کے جانشین نافع ہوئے، کم از کم بارہ برس امام مالکؒ ان کے درس میں شریک رہے، ان کی وفات کے بعد امام مالکؒ ان کے جانشین ہوئے، امام صاحبؒ کی مجلس درس ہمیشہ پُر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، جب حدیث نبوی کے املاء کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے اور اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لئے باہر تشریف لاتے[۲]۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مجلس درس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے، جاہ و جلال اور شان وشکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا اژدحام، امراء کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مؤدب نشست، درخانہ پر سواریوں کا انبوہ، دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کردیتا تھا[۳]۔

امام صاحبؒ صاحبِ حکومت نہ تھے لیکن صاحبِ حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے، پوری دنیائے اسلام امام صاحبؒ کی شہرت سے معمور ہوگئی تھی، ایشیاء،

---

[۱] المصفیٰ ۱/۱۳ [۲] تزئین الممالک نقلاً عن ابونعیم ص ۱۳ تا ۱۶ [۳] حیات مالک ص ۳۱ ومدارک ص ۶۱

افریقہ، یورپ ہر سہ براعظم سے مسافرانِ علم کے کارواں بلا انقطاع مدینہ کا رخ کرنے لگے اور اس طرح پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ يوشك أن يضرب الناس أكباد الإبل فلا يجدون أحداً أعلم من عالم المدينة ۱؎۔	حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لئے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

سفیان بن عیینہ وعبدالرزاق نے اس پیشین گوئی کا مصداق حضرت امام مالکؒ کو قرار دیا۔

تلامذہ | امام صاحبؒ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: "**حدث عنه خلق من الأئمة** ۲؎" حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "**وحدث عنه أمم لا يكادون يحصون** ۳؎" امام صاحبؒ سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے، امام مالکؒ تقریباً باسٹھ سال مسلسل فقہ وفتاویٰ، درس و تدریس میں مشغول رہے، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد تیرہ سو سے زیادہ بتائی گئی ہے ۴؎، امام زہری، شیخ اَبوالاَسود، ایوب سختیانی، ربیعہ الرائے، یحیٰ بن سعید انصاری وغیرہ ائمہ وحفاظ حدیث جو امام صاحبؒ کے شیوخ میں ہیں، انہوں نے بھی

۱؎ جامع ترمذی ج۴ص۲۷۴ ۲؎ البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۱۸۷

۳؎ تذکرہ ج۱ص۲۰۷ ۴؎ مقدمہ اسعاف الموطأ

امام صاحبؒ سے روایت کی ہے، امام محمدؒ و امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ بھی امام صاحبؒ کے تلامذہ میں ہیں [۱]۔

فقہ مالکؒ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص کہ ان مذاہب (یعنی ائمہ اربعہ کے مذاہب) کے اصولوں و امہات پر اطلاع رکھتا ہے، اس بارے میں شک نہیں کرے گا کہ ان مذاہب کی اصل حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان مشترک سی چیز ہے، اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقاء صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سبعہ اور صغار تابعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد مالکؒ کے مذہب کی بنیاد ہے کہ جس سے ان کے مذہب کی ایک خاص صورت پیدا ہوگئی [۲]۔

فقہاء سبعہ حسب ذیل حضرات ہیں، سعید بن المسیب م۹۴ھ عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود م۹۸ھ عروہ م۹۴ھ قاسم بن محمد بن ابی بکر م۱۰۸ھ ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام م۹۴ھ سلیمان بن یسار م۱۰۹ھ خارجہ بن زید م۱۰۹ھ [۳]، یہ حضرات اپنے زمانہ میں مدینہ طیبہ میں علم فقہ و حدیث کا مرجع تھے، ان کا متفقہ فیصلہ مدینہ کی عدالت کا حکم فقہی تسلیم ہوتا تھا امام مالکؒ کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد اسی فقہ مدینہ پر ہے۔

امام صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف یحیٰ بن معین جو حدیث و رجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں کہ مالکؒ امیر المومنین فی الحدیث ہیں، سفیان بن عیینہ کہتے تھے:

---

[۱] مقدمہ اُوجز ص۱۸ بحوالہ مدارک   [۲] قرۃ العینین ص۱۷۱
[۳] الجواہر المضیئۃ ج۲ ص۴۲۱

''ہم لوگ مالکؒ کے سامنے کیا چیز ہیں، ہم لوگ تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں''۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ روئے زمین پر امام مالکؒ سے بڑھ کر حدیث نبوی کا کوئی امانت دار نہیں''، امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے جب حدیث آئے تو مالکؒ ستارہ ہیں''، امام احمد بن حنبل سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر کسی کی حدیث زبانی کوئی یاد کرنا چاہئے تو کس کی کرے؟ جواب دیا کہ مالک بن انس کی۔

اخلاق وعادات امام صاحبؒ آنحضرت ﷺ کا بے حد ادب کرتے تھے جب نام مبارک زبان پر آتا، چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن ارواح طیبات کی زیارت کی ہے ان کی حالت مجھ سے بڑھ کر تھی [۱]، امام صاحبؒ کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر کے کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، ابونعیم نے ''حلیہ'' میں خود امام مالکؒ سے روایت کی ہے کہ ہارون رشید نے چاہا کہ ''موطأ'' کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کیا جائے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کیا جائے، یہ موقع وہ تھا کہ عزت طلب اشخاص کے لئے اس سے زیادہ طلائی موقع ہاتھ نہیں آ سکتا، لیکن امام صاحب نے جواب دیا ''ایسا نہ کرو خود صحابہ فروع میں مختلف ہیں اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان میں ہر شخص راہ صواب پر ہے'' [۲]۔

خلیفہ منصور نے بھی امام صاحبؒ سے ایسی ہی درخواست کی تھی، مگر امام صاحبؒ نے اس کو بھی ایسا ہی جواب دیا [۳]، حافظ ابن عبدالبر مالکی اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

---

[۱] مناقب مالک للزاوی ص ۳۳ [۲] حیات مالک ص ۸۳ [۳] تزئین الممالک ص ۴۶

وهذا غاية في الإنصاف لمن فهم[۱]. — یہ ہر ذی فہم کے نزدیک انتہائی انصاف کی بات ہے۔

جو لوگ آج فروعی مسائل میں جھگڑتے ہیں، انہیں اس سے سبق لینا چاہئے۔

مدینہ منورہ میں امام مالکؒ جس مکان میں رہتے تھے وہ مکان حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا تھا کرایہ پر لے کر ہمیشہ اس میں رہے اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا اور مسجد نبویؐ میں نشست اس جگہ کرتے تھے جہاں امیر المومنین حضرت عمرؓ نشست کرتے تھے اور یہ وہی جگہ تھی جہاں حضور اکرمؐ کا اعتکاف کے وقت بستر مبارک بچھایا جاتا تھا[۲]، امام صاحب فرماتے تھے میں نے فتوے دینا شروع نہیں کیا یہاں تک کہ مدینہ کے ستر فقہاء نے اس کی شہادت دی کہ میں فتویٰ دے سکتا ہوں[۳]۔

محمد ذوالنفس الزکیہ م ۱۳۵ھ نے مدینہ منورہ میں اوران کے بھائی ابراہیم نے بصرہ میں جب سادات پر منصور کی زیادتیوں سے تنگ آ کر علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب نے ان کا ساتھ دیا جس کے نتیجہ میں والی مدینہ جعفر بن سلیمان نے غضب ناک ہو کر امام دارالہجرۃ کی پشت پر ستر کوڑے لگوائے، تمام پیٹھ خون آلود ہوگئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے اور اونٹ پر بٹھا کر تمام شہر میں تشہیر کرائی، مگر امام صاحبؒ فرماتے جاتے تھے کہ جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالکؒ بن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق[*] جبری درست نہیں[۴]، غالباً

---

[۱] جامع بیان العلم ج ا ص ۱۳۲ [۲] مدارک از قاضی عیاض ص ۱۰۸ [۳] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۷

[*] جس کے نتیجے میں منصور کی جبری بیعت غیر معتبر ثابت ہوتی تھی، یاد رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

[۴] طبقات ابن سعد ترجمہ مالکؒ بن انس، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۸۳، ووفیات الأعیان ج ۲ ص ۲۵۳

۱۴۶ھ میں جب منصور حرمین حاضر ہوا تو والی مدینہ سے قصاص لینا چاہا مگر امام صاحب نے روک دیا اور فرمایا کہ جب کوڑا پڑتا تھا اسی وقت میں جعفر کو قرابت رسولؐ کے سبب معاف کرتا رہتا تھا[۱]۔

وفات | امام صاحبؒ کی عمر چھیاسی برس کی پہونچ چکی تھی، نہایت ضعیف وناتواں ہو گئے تھے، اس کے باوجود درس وافتاء کا سلسلہ جاری تھا، اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، بالآخر ۱۱؍ربیع الاول ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا، چھیاسی برس کی عمر شریف پائی، ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا، باسٹھ برس تک علم ودین کی خدمت انجام دی، امام کا جسدِ مبارک جنت البقیع میں مدفون ہوا[۲]۔

تصنیفات | امام صاحبؒ کی بہت سی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو'' مقدمہ أوجز المسالک''،ہم یہاں صرف ''موطأ'' جو ان کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا تفصیلی تعارف کرا رہے ہیں۔

موطأ | یہ کتب خانۂ اسلام کی وہ پہلی کتاب بتائی جاتی ہے جو قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے باقاعدہ طور پر فقہی ترتیب سے مبوب ومرتب ہوکر منصۂ شہود پر آئی۔

علامہ ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں:

''الموطأ'' هو الأصل الأول و اللباب، و كتاب ''البخاري'' هو الأصل الثاني في هذا الباب و	''موطأ'' ہی نقش اول اور بنیادی کتاب ہے'' بخاری'' کی حیثیت تو اس باب میں نقش ثانی کی ہے اور انہیں دونوں

---

[۱] مدارک ص ۲۹۳ [۲] مقدمہ اوجز ص ۷۵، ۷۶

عليهما بنى الجميع كمسلم و الترمذي [1] .	کتابوں پر مسلم و ترمذی جیسے بعد کے مؤلفین نے اپنی کتابوں کی بناء رکھی ہے۔

علامہ ذہبی ''موطأ'' کا تعارف یوں کراتے ہیں:

إن للموطأ لوقعاً في النفوس ومهابة في القلوب لا يوازيها شيئ [2] .	اس میں کوئی شک نہیں کہ دلوں میں ''موطأ'' کی ایسی تاثیر اور قلوب میں ایسی ہیبت ہے جس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کر سکتی۔

''موطأ'' درحقیقت علوم مدینہ کا مجموعہ ہے جس کو امام دارالہجرۃ مالک بن انسؓ نے جمع کیا ہے اسی لئے نواب صدیق حسن خاں نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''وایں وثوق واعتماد بر کتب دیگر نیست'' [3] ۔

معلوم ہوا کہ یہ مجموعہ وثوق واعتماد میں تمام کتابوں میں فوقیت رکھتا ہے۔

زمانۂ تالیف ظاہر ہے کہ اس کی تالیف کا مقام مدینہ طیبہ ہے، اس لئے کہ امام مالکؒ کا قیام ہمیشہ وہیں رہا ہے، البتہ تالیف کا صحیح زمانہ معلوم نہیں ہو سکا، صرف قرائن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، محدث قاضی عیاض نے ''مدارک'' میں امام مالکؒ کے شاگرد خاص ابومصعب کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ ''موطأ'' کی تالیف خلیفہ ابو منصور عباسی کی فرمائش پر خود اسی کے عہد میں شروع ہوئی تھی [4] ، لیکن پایۂ تکمیل کو اس

---

[1] بستان ص ۳، ومقدمہ التعلیق الممجد ص ۳۷

[2] مقدمہ التعلیق الممجد علی الموطأ للامام محمد جدید ص ۳۷ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۸ ص ۲۰۱

[3] اتحاف النبلاء ص ۱۶۵ [4] تزئین الممالک للسیوطی ص ۴۳

کی وفات کے بعد پہونچی ۱؎، منصور نے ۶/ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں وفات پائی اوراس کی جگہ اس کا بیٹا محمد المہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا، اوراس کی خلافت کے ابتدائی دور میں اس کی تالیف پوری ہوئی۔

ابتدائے تالیف کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ ابن حزم نے صراحت کی ہے کہ امام مالکؒ نے ''موطأ'' کی تالیف یحییٰ بن سعید الانصاری المتوفی ۱۴۳ھ کی وفات کے بعد کی ہے ۲؎۔

وجہ تسمیہ | لفظ ''موطأ'' توطیہ کا مفعول ہے، صاحب ''قاموس'' نے اس کے معنی ''روندنے'' تیار کرنے اورنرم وسہل بنانے کے بیان کئے ہیں، ''موطأ'' کے لغوی معنی ''روندا ہوا''، ''تیار کیا ہوا''، ''نرم اورسہل بنایا ہوا'' ہیں، یہ تمام معانی بطوراستعارہ کے یہاں مراد لئے جاسکتے ہیں ۳؎۔

ابوحاتم رازی سے دریافت کیا گیا کہ اس کا ''موطأ'' کیوں نام رکھا گیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ امام مالکؒ نے اس کو مرتب کر کے لوگوں کے لئے سہل و آسان بنادیا ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس کتاب کو لکھ کر میں نے فقہاء مدینہ میں ستر فقیہوں کے سامنے پیش کیا، سب ہی نے مجھ سے اتفاق کیا، اس لئے میں نے اس کا نام ''موطأ'' رکھا ہے ۴؎، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس معنی کو اپنی شرح ''مسویٰ'' میں راجح قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ''موطأ'' کے معنی روندے ہوئے، چلے ہوئے کے ہیں یعنی

۱؎ مقدمہ اُوجز ص ۲۰ ۲؎ توجیہ النظر ص ۱۷

۳؎ قاموس ج ا ص ۲۲ ۴؎ مقدمہ اُوجز ص ۲۲

جس پر عام ائمہ وعلماء اور اکابر چلے ہوں، اور سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اتفاق بھی کیا ہو[1]، چونکہ یہ معنی خود صاحب کتاب سے منقول ہیں، اس لئے اسی کو ترجیح دی جائے گی۔

موطأ کی غرض ''موطأ'' سے پہلے اور خود امام مالکؒ کے زمانہ میں بہت سے حدیث کے مجموعے تیار ہو چکے تھے، مگر ان کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا جو التزام کہ ''موطأ'' میں کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حبان کتاب ''الثقات'' میں فرماتے ہیں:

كان مالكؒ أول من انتقى الرجال من الفقهاء بالمدينة، و أعرض عمن ليس بثقة في الحديث، ولم يكن يروي إلا ماصح، ولا يحدث إلا عن ثقة[2].	امام مالکؒ فقہاء مدینہ میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے رواۃ کے متعلق تحقیق سے کام لیا اور حدیث میں جو ثقہ نہ ہوں ان کی روایت سے اعراض کیا، وہ صحیح روایات کے علاوہ نہ کوئی روایت نقل کرتے ہیں اور نہ کسی غیر ثقہ سے حدیث ہی بیان کرتے ہیں۔

امام دار الہجرۃ مالک بن انسؒ کے مذہب کی بناء اول احادیث صحیحہ اور بنائے ثانی آثار صحابہؓ وتابعین ہیں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جاننا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث سے خواہ وہ مسند ہو یا مرسل نیز حضرت عمرؓ کے اَثر اور عبداللہ بن عمرؓ کے عمل سے

[1] مقدمہ مسوّیٰ ص ٦ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۵۳، ترجمہ امام مالک

استدلال کرنا اور صحابہؓ وتابعین مدینہ کے فتاوے سے اخذ کرنا
خصوصاً جب کہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو،
امام مالکؒ کے مذہب کا اصول ہے''۱؎۔

اور انہیں تمام مذکورہ بالا باتوں کے ملحوظ رکھنے کی وجہ سے ''موطأ'' اہل مدینہ کی روایات اور فتاوے کا بہترین انتخاب ہوگئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے:

فصنف الإمام مالكؒ "الموطأ"، و توخىٰ فيه القوي من حديث أهل الحجاز، ومزجه بأقوال الصحابة و فتاوىٰ التابعين ومن بعدهم۲؎.	امام مالکؒ نے ''موطأ'' تصنیف کی اور اس میں اہل حجاز کی قوی روایات کا قصد کیا اور اس کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے اقوال اور تابعین وعلماء مابعد کے فتاوے بھی درج کردیے۔

موطأ کا کتب حدیث میں مقام جمہور علماء نے طبقات کتب حدیث کے اندر طبقۂ اولیٰ میں ''موطأ'' مالک کا شمار کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ نے کتب حدیث کے پانچ طبقات قائم کئے ہیں، جن میں ''موطأ'' کو اولیٰ میں رکھا ہے بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''موطأ'' کو تمام کتابوں میں مقدم وافضل سمجھتے ہیں، اپنی مشہور کتاب ''مصفّٰی شرح موطأ'' کے مقدمہ میں اس کی ترجیح کے دلائل ووجوہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں بھی فرماتے ہیں:

۱؎ مصفّٰی ج۱ ص۱۷ ۲؎ مقدمہ فتح الباری ص۸

واتفق أهل الحديث على أن جميع ما فيه صحيح علىٰ رأي مالكؒ ومن وافقه، و أما علىٰ رأي غيره فليس فيه مرسل ولا منقطع إلا وقد اتصل السند به من طرق أخرىٰ، فلا جرم أنها صحيحة من هذا الوجه۱.	محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کتاب کی تمام روایات امام مالکؒ اوران کے موافقین کی رائے میں صحیح ہیں، اور دوسروں کی رائے بھی اس سلسلے میں یہی ہے کہ ''موطأ'' کی مرسل ومنقطع روایات کی سند دوسرے طرق سے متصل ہے پس اس میں کوئی شبہہ نہ رہا کہ اس اعتبار سے وہ سب صحیح ہیں۔

صاحب ''مفتاح السعادة'' نے بیان کیا ہے کہ جمہور کہتے ہیں کہ اس کا درجہ ترمذی کے بعد ہے مگر صحیح یہ ہے کہ مسلم کے بعد تیسرے درجہ پراس کو رکھنا چاہئے ۲۔

حافظ ابوزرعہ رازی جو بخاری ومسلم دونوں ہی سے بخوبی واقف ہیں، ان کو ''موطأ'' کی صحت کا اس درجہ یقین ہے کہ فرماتے ہیں:

لو حلف رجل بالطلاق علىٰ حديث مالك في "الموطأ" أنها صحاح لم يحنث۳.	اگر کوئی شخص اس پر طلاق کا حلف اٹھالے کہ ''موطأ'' میں امام مالکؒ نے جو حدیثیں بیان کی ہیں صحیح ہیں تو وہ حانث نہ ہوگا۔

---

۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۳
۲ مقدمہ أوجز المسالک ص ۳۲
۳ تزئین الممالک ص ۴۴

امام شافعیؒ کی شہادت | ''موطاً'' کی صحت ومرتبہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:

ما علیٰ ظهر الأرض كتاب بعد كتاب الله أصح من كتاب مالك ۱؎.	روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد ''موطاً'' مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔

اگرچہ خود علماء شوافع میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں:

إنما قال ذلك قبل وجود كتاب البخاري و مسلم ۲؎.	امام موصوف کا یہ قول بخاری ومسلم کی کتابوں کے عالم وجود میں آنے سے پہلے کا ہے۔

حافظ ابن حجر نے مقدمہ ''فتح الباری'' میں حسب ذیل تقریر کی ہے:

''بعض ائمہ نے بخاری کی کتاب کو امام مالکؒ کی کتاب پر اصح قرار دینا مشکل بتایا ہے، کیوں کہ دونوں ہی صحت اور انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں، بخاری کی روایات اگرچہ زیادہ ہیں مگر یہ صحت کی افضلیت کو مستلزم نہیں ہیں''۔

پھر اس اشکال کا خود ہی جواب دیتے ہیں:

''بخاری کی اہمیت دراصل اشتراط صحت ہی کی بنا پر ہے اور امام مالکؒ چونکہ انقطاع اسناد کو قادح نہیں سمجھتے اس لئے مراسیل، منقطعات، بلاغات کو اصل موضوع کتاب ہی میں نقل کرتے

۱؎ مقدمہ اوجز ص ۹۳ ۲؎ مقدمہ التعلیق الممجد ص ۷۷

چلے آئے ہیں، اور امام بخاری انقطاع کو چونکہ علت قادحہ سمجھتے ہیں اس لئے ایسی روایات کو وہ تعلیقات و تراجم میں (جو اصل موضوع کتاب سے خارج ہے) درج کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ ایک قوم کے نزدیک قابل احتجاج ہیں مگر پھر بھی اس کی بہ نسبت متصل روایات جب دونوں کے رواۃ عدالت وحفظ میں مشترک ہوں زیادہ قوی ہیں، پس اسی سے بخاری کی فضلیت عیاں ہوگئی، نیز یہ معلوم ہوا ہے کہ امام شافعی نے جو ''موطأ'' کو صحت میں افضل بتایا ہے وہ ان مجموعوں کے لحاظ سے تھا جو ان کے زمانہ میں موجود تھے، جیسے ''جامع سفیان ثوری''، ''مصنف حماد بن سلمہ'' وغیرہ ان پر ''موطأ'' کی فضیلت بلاکسی نزاع کے مسلم ہے [۱]۔

لیکن حافظ کا یہ بیان دونوں کتابوں کے تقابل کے لحاظ سے تو بیشک صحیح ہے ورنہ ''موطأ'' کے تمام مراسیل ومنقطعات وبلاغات متصل ومرفوع ومسند ہیں۔

حافظ ابن حجر نے ''موطأ'' اور ''بخاری'' کی منقطع روایات کے درمیان جو فرق بیان کیا ہے اس پر علامہ سیوطی نے نقد کیا ہے کہ ''موطأ'' کے مراسیل تو امام مالکؒ اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک بیشک حجت ہیں، اور ایسی مرسل حدیث تو علمائے شوافع کے نزدیک بھی حجت ہے بشرطیکہ دوسری اسانید سے اس کی تائید ہو رہی ہو اور ''موطأ'' کی ہر حدیث کے متابعات وشواہد موجود ہیں اس لئے ''موطأ'' مطلقاً صحیح

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص۱۳

ہے، بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام وہ کتابیں جو سنن کے باب میں تصنیف کی گئی ہیں جیسے ''سنن ابوداوٗد'' و''نسائی'' یا ان کا فقہ سے تعلق ہے جیسے ''صحیح بخاری''، ''جامع ترمذی'' یہ سب ''موطأ'' مالک کے مستخرجات ہیں جو اس کے اردگرد گھومتی ہیں اور ان سب کا مطمحِ نظر ''موطأ'' کی مرسل روایت کا اتصال اور موقوف کا مرفوع اور مافات کا استدراک ومتابعات وشواہد کا ذکر ہے اور اس حقیقت کو وہی جان سکتا ہے جس کی اس کتاب پر گہری نظر ہو[۱]۔

اسی لئے حافظ مغلطائی نے ''موطأ'' و''بخاری'' دونوں کو ایک ہی درجہ پر رکھا ہے فرماتے ہیں:

> ''موطأ'' و''بخاری'' میں اس باب میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ یہ چیزیں تو ''بخاری'' میں بھی ہیں، چنانچہ تعلیقات اور ایسی بہت سی چیزیں اس میں بھی پائی جاتی ہیں''[۲]۔

اس گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ صحت کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو ''موطأ'' کو بعض وجوہ سے ''صحیحین'' پر بھی ترجیح حاصل ہے۔

(۱) امام مالک تبع تابعی ہیں، اس لئے ''موطأ'' کی روایات میں تین چار واسطوں سے زیادہ نہیں ہے، ''صحیح بخاری'' کو اگر یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں بائیس ثلاثیات ہیں تو یہاں ''موطأ'' کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے، بلکہ اس میں چالیس ثنائیات ہیں یعنی حضور ﷺ اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔

---

[۱] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص۱۵۹ [۲] تزئین الممالک ص۴۷

(۲)　امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک ضروری ہے کہ راوی جس روایت کو بیان کرے اس کا وہ حافظ ہو، لیکن امام بخاری و مسلم کے نزدیک یہ شرط نہیں [۱]۔

موطأ کی مقبولیت امام مالکؒ کے شیوخ ومعاصرین نے ''موطأ'' کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ امام صاحبؒ نے فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کیا تو سب نے داد تحسین دی اور بعد کے علماء کے نزدیک انتہائی مقبول رہی ہے، علامہ نووی ''شرح مسلم'' کے مقدمہ میں اپنے استاد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک کتاب مجھ کو ایسی ملی جو ان تمام کتابوں (بخاری، مسلم و ترمذی وغیرہ) سے بہتر ہے اگر چہ یہ کتابیں بھی اچھی ہیں، اور وہ ''موطأ'' ہے جس کے مصنف کا نام مالک بن انس ہے جو تمام محدثین کے شیخ الشیوخ ہیں'' [۲]۔

علامہ زرقانی شارح ''موطأ'' فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے جب اس کتاب کو تصنیف کیا تو دوسرے علماء نے بھی اسی طرز سے احادیث کے مجموعے تیار کئے، لوگوں نے امام مالکؒ سے جا کر بیان کیا تو فرمایا کہ صرف اخلاص وحسن نیت کو بقا ہے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی ''موطأ'' مالک کے سوا اور کوئی ''موطأ'' دنیا میں باقی نہیں رہی [۳]۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی حیات ہی میں یہ کتاب پوری دنیائے اسلام میں مشہور ہوگئی تھی، جتنا زمانہ گزرتا گیا اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا اور لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی، اس مقدس کتاب کی تنہا یہ خصوصیت ہے کہ سلاطین زمانہ مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین جیسے مشاہیر خلفاء اسلام نے

---

[۱] تدریب ج ۲ ص ۹۳　[۲] مقدمہ شرح مسلم ص ۶　[۳] مقدمہ اُوجز ص ۲۰

اس کے سماع کے لئے عراق سے حجاز تک بادیہ پیمائی کی [۱]۔

روایات کی تعداد ابتداء میں ''موطأ'' میں دس ہزار حدیثیں تھیں مگر امام صاحب نے سب کو قلم زد کر دیا، اب ۱۷۲۵ باقی ہیں جس میں مسند و مرفوع ۶۰۰ اور مرسل ۲۲۲ موقوف ۶۱۳ تابعین کے اقوال وفتاوے ۲۸۵ ہیں [۲]۔

موطأ کے مراسیل و بلاغات امام مالکؒ کے مراسیل و بلاغات بہت ہی اہم سمجھے جاتے ہیں علامہ ابن عبدالبر مالکی نے اس موضوع پر مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس میں ''موطأ'' کی مرسل، منقطع اور معضل روایات کا اتصال بیان کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں جہاں کہیں بلغني یا عن الثقة عندي آیا ہے اور اس کی سند نہیں بیان کی ہے وہ ۶۱ مقامات ہیں، ان سب روایات کو امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے حضرات نے مسنداً بیان کیا ہے، البتہ چار احادیث ایسی ہیں جن کی اسناد معلوم نہ ہوسکیں، وہ یہ ہیں [۳]

(۱) إني لا أنسىٰ ولكن أُنسَّىٰ لأسُنَّ. أخرجه فی ٤، كتاب السهو حديث ٣، وفي رواية أخرى: إني أنسى أو أنسَّىٰ لأسُنَّ، كتاب السهو

(٢) إن النبي ﷺ أُري أعمار الناس قبله، أو ما شاء الله من ذلك، كأنه تقاصر أعمار أمته أن لا يبلغوا من العمل، مثل الذي بلغ غيرهم في طول العمر، فأعطي ليلة القدر. ١٩، كتاب الاعتكاف حديث ١٥.

(٣) قول معاذؓ: آخر ما أوصاني رسول الله صلى الله عليه وسلم إلخ كتاب ٤٧، حديث ١.

---

[۱] الحطہ ص ۵۵ [۲] مقدمہ أوجز ص ۱۰۹

[۳] لیکن شیخ ابن صلاحؒ نے ان کی اسانید بیان کی ہے (السنة و مكانتها ص ۴۸۸) اور حافظ ابن عبدالبر کی اس موضوع پر مستقل کیاب ہے ''الرسالة المستطرفة'' (ص:۲۵)

(٤) **إذا أنشـأت بحرية ثم تشاء مت فتلك عين غديقة** ۱؎. **كتاب الاستسقاء ۱۳ حديث ٥ .**

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ'' مسند دارمی'' کی تصنیف ہی ''موطأ'' کی احادیث کے بیان اسناد کے لئے ہوئی ہے ۲؎۔

''موطأ'' میں غیر مدنی شیوخ کی روایات شاذ ونادر ہی ہیں، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ کی بلاغات کو امام مالکؒ نے عبداللہ بن ادریسؒ سے سنا ہے۔

موطأ کی خصوصیات اب ہم مختصراً ''موطأ'' کی خصوصیات اور بعض خاص اصطلاحات کی جانب اشارہ کریں گے۔

(۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں:''**السنة التي لا اختلاف فيها عندنا كذا و كذا**'' (یعنی وہ سنت کہ جس کے بارے میں ہمارے یہاں کوئی اختلاف نہیں) یہ ان مسائل کے بارے میں فرماتے ہیں جن میں اہل مدینہ کا اتفاق ہوتا ہے۔

(۲) اگر اہل شہر میں اختلاف ہوتا تو سب سے قوی اور راجح قول کو اختیار کرتے تھے خواہ یہ قوت کثرت قائلین سے حاصل ہوتی ہو یا کسی قیاس قوی کی موافقت سے یا کتاب وسنت کی تخریج سے، اسی قسم کے مسائل میں امام مالکؒ یوں فرمایا کرتے ہیں کہ:

''**هذا أحسن ما سمعت**''۳؎. جو کچھ میں نے سنا ہے اس میں یہ بہتر ہے۔

(۳) باب کے تحت ان مسائل فقہیہ کو بیان کرتے ہیں کہ جو اس سے مناسبت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے اجتہادات کو بھی نقل کردیتے ہیں۔

(۴) امام مالکؒ کے سامنے بہت سے حدیث کے مجموعے تھے، جب اس میں سے

۱؎ مقدمۂ أوجز ص ۱۱۱ والتعلیق الممجد ج ۱ ص ۷۵ ۲؎ مقدمہ مسوّیٰ ص ۶

۳؎ الإنصاف ص ۳۷ و حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۴۱۷

کسی روایت کا انتخاب فرماتے ہیں تو اس کو **بلغني** کے صیغے سے بیان کرتے ہیں [۱]۔

(۵) امام مالک "**عن الثقة عن بكير بن عبدالله الأشج**" کہتے ہیں تو قاضی ابن عبدالبر کی تحقیق میں اس ثقہ سے مراد مخرمہ بن بکیر ہیں، حافظ ابن حجر کا بھی یہی خیال ہے البتہ امام نسائی کے نزدیک اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد عمرو بن الحارث کو لیا جائے۔

(۶) کبھی فرماتے ہیں "**أخبرني من لا أتهم من أهل العلم**" تو یہاں مراد لیث بن سعد ہیں۔

(۷) جب "**عن الثقة عن عمرو بن شعيب**" کہتے ہیں تو ثقہ سے مراد ابن عبدالبر مالکی کے نزدیک عبداللہ بن وہب ہیں اور حافظ ابن حجر کی تحقیق میں عمرو بن حارث یا عبداللہ بن لہیعہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مراد لیا جائے۔

(۸) اور جب "**عن الثقة عن ابن عمر**ؓ" فرماتے ہیں تو یہاں ثقہ سے ان کی مراد نافع ہیں۔

موطأ کے رواۃ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ اپنی کتاب "بستان المحدثین" میں فرماتے ہیں کہ:

"امام مالکؒ سے تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے روایت کی ہے"۔

اس کثرت تعداد واختلاف اوقاف کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی کتاب میں کمی وزیادتی، تقدیم وتاخیر کا ہونا لازمی ہے، حافظ صلاح الدین علائی لکھتے ہیں کہ "موطأ" کو امام مالکؒ سے بکثرت لوگوں نے روایت کیا ہے، اس لئے ان کی روایات میں تقدیم وتاخیر، کمی وزیادتی موجود ہے [۲]، جب کہ امام موصوف برابر انتخاب وتہذیب کرتے رہتے تھے۔

---

[۱] مقدمہ مصفّٰی ص۶ [۲] مقدمہ اَوجز ص۹۸

چنانچہ ''موطأ'' امام صاحب سے تیس طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور سولہ نسخے ہیں اوران میں بھی چار زیادہ اہم ہیں، یعنی یحییٰ وابن بکیر، ابومصعب اور ابن وہب کے نسخے۔

(۱) لیکن سب سے مشہور ومتداول یحییٰ بن مصمودی اندلسی (المتوفی ۲۳۴ھ) کا نسخہ ہے، انہیں کے نسخے کی شرح علامہ سیوطی، زرقانی اور باجی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے، یہ بربر کے مشہور قبیلے مصمودہ کی طرف منسوب ہوکر مصمودی کہلاتے ہیں، ان کے دادا (جنہوں نے اندلس کواپنا وطن بنایا) پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، قرطبہ میں امام مالکؒ کے شاگرد زیاد بن عبدالرحمٰن ''موطأ'' کا درس دیتے تھے، یحییٰ نے پہلے انہیں سے پوری ''موطأ'' کا سماع حاصل کیا، مگر شوق علم انہیں ۲۸ سال کی عمر میں مدینہ طیبہ لایا جہاں انہوں نے امام مالکؒ سے ''موطأ'' پڑھی، ابھی ''موطأ'' کی قرأت کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ امام دارالہجرۃ کا انتقال ہوگیا، اس لئے یحییٰ کے نسخے میں تمام احادیث ''حدثنا'' سے شروع ہوتی ہیں لیکن ''**باب خروج المعتكف إلى العيد**'' ''**باب قضاء الاعتكاف**''، ''**باب النكاح في الاعتكاف**''، میں ''**حدثنا**'' زیاد عن مالک ہے یعنی زیاد کا واسطہ زیادہ ہے۔

ان کے نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ امام صاحب سے آخری زندگی میں سماع حاصل کیا بلکہ تجہیز وتکفین میں شریک رہے، مگر ابھی یحییٰ کی علمی پیاس نہ بجھی تھی، اس لئے انہوں نے دوبارہ اندلس سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور اس سفر میں امام مالکؒ کے خاص شاگرد، ابن القاسم سے استفادہ کیا، امام مالکؒ بھی یحییٰ کی بڑی عزت کرتے تھے، ہاتھی کا مشہور واقعہ انہیں کا ہے، اندلس میں حکومت ان کا خاص احترام کرتی تھی، ''

موطاً ‘‘ کی بلادمغرب میں شہرت کا خصوصی سبب ان کا وجود ہے، چار مسئلوں کے علاوہ ہر بات میں امام مالکؒ کے مقلد تھے،۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے ،۸۲ سال کی عمر پائی ، ۲۳۴ھ میں انتقال ہوا[1]۔

(۲) دوسرا مشہور نسخہ امام محمد بن حسن شیبانی (المتوفی ۱۸۹ھ) کا ہے جس طرح یحیٰ کے نسخے کو بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اسی طرح اس نسخے کو بھی ہے، بلکہ بہت سے وجوہ سے ترجیح بھی دی جاسکتی ہے کیوں کہ امام محمد تین سال امام مالکؒ کی خدمت میں رہے، جس کو تفصیل کے ساتھ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح ’’التعلیق الممجد ‘‘ کے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔

چونکہ امام محمدؒ نے اپنی ’’موطاً ‘‘ میں بہت سے آ ثار و روایات اور مسائل کو امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے حضرات سے نقل کیا ہے اس لئے مجازاً اس کا انتساب امام محمدؒ ہی کی طرف ہونے لگا۔

اس میں احادیث مرفوعہ اور موقوفات صحابہؓ مسند و مرسل روایات کی مجموعی تعداد ۱۱۸۰ ہے، جس میں ۱۰۰۵ تو امام مالکؒ سے اور ۱۷۵ دوسرے طریق سے ،جن میں ۱۳ تو امام ابوحنیفہؒ سے اور ۴ قاضی ابو یوسفؒ سے اور بقیہ دیگر حضرات سے مروی ہیں[2]۔

’’موطاً ‘‘ کے دیگر نسخوں سے تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ ’’اُوجز المسالک‘‘ ’’التعلیق الممجد ‘‘ اور ’’بستان المحد ثین‘‘۔

شروح وتعلیقات ’’موطاً ‘‘ کی مقبولیت و ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ اس کو

---

[1] مقدمہ التعلیق الممجد ص ۸۲ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۰ ص ۵۱۹ [2] مقدمہ التعلیق الممجد جدید ص ۱۴۱

شارحین ومعلقین ومحشیین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئی ہے، علامہ ابن فرحون فرماتے ہیں کہ جن علماء نے اس کی حدیث ورجال پر اعتناء کیا اور اس میں تصنیف کی ہے ان کی تعداد بہت بڑی ہے، اس میں علماء مالکیہ کے علاوہ دوسرے حضرات بھی ہیں، قاضی عیاض نے اپنی معلومات کے مطابق ان کی تعداد ۹۹ بتائی ہے، ان کے بعد بھی اس میں ہر زمانہ میں اضافہ ہی ہوا ہے، ہمیں ان کا تفصیلی تعارف مقصود نہیں ہے، اس کے لئے ملاحظہ ہو "اوجز المسالک" کا مقدمہ، البتہ سرسری طور پر ہم چند شروح وتعلیقات کا ذکر کر رہے ہیں۔

(۱) "المنتقی": ابوالولید الباجی (المتوفی ۴۷۴ھ) کی شرح ہے جو طبع ہو چکی ہے، صاحب "کشف الظنون" فرماتے ہیں کہ یہ ابن عبدالبر کی شرح "التمہید" کا اختصار ہے۔

(۲) **کتاب "التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد"** از حافظ ابن عبدالبر مالکی (المتوفی ۴۶۳ھ) ۲۶ جلدوں میں وزارۃ اوقاف مغرب نے شائع کیا ہے۔

"موطأ" کے معانی کی تشریح اور اس کے اسانید کی تحقیق، نیز اس کے ضمن میں فقہ وحدیث کی بے شمار معلومات بہ ترتیب شیوخ امام مالکؒ اور بہ لحاظ حروف تہجی درج ہیں۔

(۳) **"الاستذکار"** حافظ ابن عبدالبر نے خود ہی اپنی شرح "التمہید" کا اختصار کیا ہے، بہت کافی اضافہ بھی کیا ہے اب یہ کتاب ۳۰ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۴) **"القبس في شرح موطأ مالک بن أنس"** یہ قاضی ابوبکر بن العربی

(المتوفی ۵۴۳ھ) کی شرح ہے جو بیروت سے تین جلدوں میں طبع ہوچکی ہے۔

(۵) ''کشف المغطا عن الموطأ''للحافظ جلال الدین السیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) کی شرح ہے۔

(۶) ''تنویر الحوالک للسیوطي'' ''کشف المغطا'' کا اختصار ہے، طبع ہو چکی ہے۔

(۷) ''تجرید أحادیث موطأ للسیوطي''شرح ط۔

(۸) ''إسعاف المبطأ برجال الموطأ'' للسیوطي شرح ط۔

(۹) ''شرح زرقانی'' محمد بن عبدالباقی زرقانی مالکی (المتوفی ۱۲۲اھ) یہ نفیس شرح چھپ کر مشہور ومتداول ہوچکی ہے، اکثر حصہ ''فتح الباری'' سے ماخوذ ہے، مصنف نے ۱۱۰۹ھ میں شروع کرکے ۱۱/ذی الحجہ ۱۱۱۲ھ کو مکمل کیا ہے۔

(۱۰) ''المصفّٰی''، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ)

(۱۱) ''المسوّی''، ''مصفٰی'' فارسی میں ''موطأ'' کی تعلیق ہے اور ''مسوّیٰ'' عربی میں اسی کا اختصار ہے، دونوں کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔

(۱۲) شرح موطأ ''الفتح الرحمانی''، از شیخ پیری زادہ حنفی جن کا پورا نام ابومحمد ابراہیم بن حسین ہے، انہوں نے ۱۰۹۲ھ میں وفات پائی، اکثر علامہ عینی کی شرح سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، مدینہ طیبہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۱۳) ''المحلّٰی بأسرار الموطأ'' سلام اللہ حنفی (متوفی ۱۲۲۹ھ) جو حضرت عبدالحق دہلویؒ کی اولاد میں سے ہیں، اس کا آخری حصہ مظاہر علوم سہارن پور کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ابتدائی حصہ پٹنہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

(۱۴) ''التعلیق الممجد علی موطأ محمدؒ''، مولانا عبدالحی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) کی شرح ہے جو متعدد بار طبع ہو چکی ہے، اس ناچیز کی تعلیق وتحقیق کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں ۱۹۹۳ء میں بیروت سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

(۱۵) ''أوجز المسالک إلی موطأ مالک''، حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کی گراں قدر شرح ہے جو چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، متقدمین کی شروح کا خلاصہ ہے، ہر باب میں ائمہ اربعہ کا مذہب معتبر کتب سے نقل کیا گیا ہے، حل لغات وحل مطالب اور مشکل مقامات کی پوری وضاحت کی گئی ہے، بعض جلیل القدر علمائے مالکیہ نے اس کی جلالت کا اعتراف کیا ہے کہ اس سے زیادہ ہمیں اپنے مسلک کی تحقیق معلوم نہیں، مذہب حنفیہ کی توجیہ کے بعد مختصراً دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں، آغاز کتاب میں ایک نہایت مبسوط مقدمہ ہے، جس میں فن حدیث اور خصوصاً ''موطأ'' مالک کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، اس کتاب میں اس سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے۔

پہلے چھ جلدوں میں سہارنپور سے شائع کی گئی تھی، اس کے بعد ۱۵ جلدوں میں بیروت وقاہرہ سے شائع کی گئی، اس کی طباعت میں کثرت سے اغلاط واقع ہوئے تھے، اس ناچیز نے ان اغلاط وسقطات کی تصحیح وتخریج احادیث وتعلیق وتحقیق کے بعد مرکز الشیخ أبي الحسن الندوي سے نہایت خوبصورت انداز میں بیروت سے ۱۸ر جلدوں میں شائع کرایا ہے۔

اس کے علاوہ مفتی محمد شفیع صاحب کا حاشیہ اور مولانا اشفاق الرحمٰن کی تعلیق بھی مشہور ہے، استاذ محمد فؤاد عبدالباقی نے ''موطأ'' کی تحقیق اور احادیث کی ترقیم اور

فہارس کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ''موطأ'' کی عظیم الشان خدمت کی ہے، تحقیق و تعلیق کے بعد مفصل فہارس تیار کی ہے اور کتاب ۷/جلدوں میں ابوظبی سے شائع ہوئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے ناچیز کی کتاب ''**الإمام مالک و کتابه الموطأ**'' یا اس کے ترجمہ کا مطالعہ کیا جائے۔

امام شافعیؒ

نام ونسب وابتدائی حالات نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ناصر السنۃ شافعی ان کے جداعلیٰ شافع کی طرف نسبت ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید القریشی الہاشمی المطلبی، ساتویں پشت پر آپ کا سلسلۂ نسب آنحضرت ﷺ سے مل جاتا ہے۔

آپ بمقام غزہ[1] رجب ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، امام شافعی کی پیدائش اسی دن کی ہے جس دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا، صحیح قول کے مطابق آپ کی والدہ قبیلۂ ازد سے تھیں جو یمن کا ایک ممتاز ومشہور قبیلہ ہے، جب امام شافعی کی عمر دو سال کی ہوئی تو ان کی والدہ ان کو حجاز لے گئیں اور وہاں سے اپنے قبیلہ میں یمن منتقل ہو گئیں، یمن میں امام شافعی نے اپنی عمر کے دس سال گزارے، اب ان کی والدہ کو نسبی شرافت کے

---

[1] جائے پیدائش میں اختلاف ہے عسقلان کو بھی بتایا گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ چونکہ مقام غزہ عسقلان سے تین فرسخ پر واقع ہے، غزہ قریہ ہے اور عسقلان اس کا شہر، اس لئے مجازاً عسقلان کو بھی بتایا گیا، ایک روایت یہ بھی امام شافعی سے نقل کی گئی کہ میری پیدائش یمن کی ہے، علامہ ذہبی نے اس کی تردید کی اور حافظ ابن حجر نے وہم راوی قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ میری نشو ونما یمن میں ہوئی ہے۔ (توالی التاسیس ص ۳۹)

ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا اس لئے وہاں سے انہیں لے کر مکہ معظّمہ آ گئیں ۱؎، وہیں انہوں نے نشو ونما پائی ۲؎۔

امام شافعی کی پیدائش ایک غریب گھرانے میں ہوئی، باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ذکاوت و ذہانت سے نوازا تھا، سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے تھے، حفظ قرآن کے بعد حفظ حدیث پر متوجہ ہوئے، جب عمر شریف دس سال کی پہونچی تو ''موطأ'' مالک یاد کرلیا تھا اور پندرہ سال کی عمر میں اپنے شیخ مسلم بن خالد زنجی کی اجازت سے فتوے دینے لگے، امام صاحب نے قبیلۂ ہذیل میں رہ کر ان کے اشعار میں اتنا کمال پیدا کرلیا تھا کہ اصمعی جیسا شاعر یگانۂ روزگار جو ادب ولغت میں امامت کا درجہ رکھتا ہے، امام صاحب سے اپنے اشعار کی تصحیح کراتا تھا ۳؎۔

طلب علم | امام شافعی کو اگرچہ علم کا شوق ابتدا سے تھا مگر باقاعدہ طلب علم کا آغاز مکہ معظّمہ سے ہوا جو اسلام کی ابتدائی دو صدیوں تک علم کا بہت بڑا مرکز تھا علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ عہد صحابہؓ میں یہاں علم کم تھا، پھر صحابہؓ کے دورِ اخیر میں اس کی کثرت ہوئی، اسی طرح عہد تابعین و تبع تابعین میں بڑے بڑے فقہاء ومحدثین ہوئے، اس کے بعد حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

''ثم في أثناء المائة الثالثة تناقص علم الحرمين و كثر بغيرها''.	پھر تیسری صدی میں حرمین کا علم کم ہو گیا اور دوسری جگہوں پر کثرت ہوئی۔

۱؎ طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۱ ص ۱۰۰، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۱ ووفیات الأعیان ج ۳ طبع جدید ۳۰۶ ۲؎ حسن المحاضرہ ص ۱۶۶ ۳؎ وفیات الأعیان ج ۳ ص ۳۰۶

دراصل وہاں کی علمی رونق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ سے تھی، بہر کیف امام شافعیؒ سب سے پہلے مسلم بن خالد زنجی مفتی مکہ کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے، اوران سے مسلسل تین سال استفادہ کیا، جب عمر تیرہ سال کی ہوئی تو مدینہ طیبہ امام دارالہجرۃ مالکؒ بن انس کے آستانے پر حاضر ہوئے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ تمہارے قلب میں ایک نور ہے، معاصی سے اسے ضائع نہ کرنا، تم تقوے کو اپنا شعار بنانا، ایک دن آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوگے [۱]، امام مالک کے سامنے ''موطأ'' کی قرأت زبانی کی، امام موصوف کو اس پر تعجب ہوا، امام شافعی صرف آٹھ ماہ امام مالکؒ کی خدمت میں رہے [۲]، اس کے بعد مدینہ منورہ سے واپس مکہ معظّمہ آ گئے، اور وہاں کے شیوخ بالخصوص محدث شہیر سفیان بن عیینہ سے استفادہ کرتے رہے۔

امام شافعیؒ پر دورِ ابتلاء اس کے بعد امام شافعیؒ کو فکر معاش دامن گیر ہوئی، اتفاقاً مکہ معظّمہ میں والی یمن آیا، اس سے بعض عمائد قریش نے سفارش کی کہ شافعی میں ایسی اہلیت موجود ہے کہ انہیں کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے، چنانچہ نجران کے عامل بنا دیئے گئے، مگر والی یمن بہت سفاک و ظالم تھا، امام صاحبؒ اس کو ظلم وزیادتی و بے انصافی کرنے سے روکتے تھے، اس لئے والی یمن نے ناراض ہوکر ہارون رشید کو خط لکھا کہ شافعیؒ علوی سادات کے ساتھ ہیں، جس سے بڑا اندیشہ ہے، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا اور والی یمن کو خط لکھوایا کہ شافعی اوران کے تمام ساتھیوں کو فوراً دارالخلافہ بھیج دو، چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی اور امام شافعی کو گرفتار کر کے دربارِ خلافت میں بھیج دیا گیا، خلیفہ کے سامنے پیش ہوئے، وہاں قاضی امام محمدؒ

۱؎ توالی التاسیس ص ۳۲ ۲؎ تأنیب الخطیب ص ۱۸۲

موجود تھے، جب انہیں معلوم ہوا تو وہ بھی دربارِ خلافت میں پہونچ گئے، چنانچہ امام محمدؒ کی سفارش پر امام شافعیؒ کی رہائی ہوئی، یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے، جب امام صاحب کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔

امام محمدؒ کے حلقہ میں امام شافعیؒ کی شرکت امام شافعیؒ ہارون رشید کی تلوار سے نجات پا کر امام محمدؒ کے زیرِ سایہ آ گئے، یہاں آنے سے پہلے امام محمدؒ کے مرتبۂ اجتہاد و تفقہ سے پورے طور سے واقف ہو چکے تھے کیوں کہ امام محمدؒ فقہ عراق کے حامل و ناشر تھے، یہیں سے شافعی کی زندگی نے پلٹا کھایا، اور از سرِ نو تحصیل علم میں مشغول ہوئے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ شافعیؒ نے فقہ عراق کو بکمال حاصل کیا اور امام محمدؒ کی خدمت میں تیس سال سے زائد رہے، بالآخر فقہ کے بانی و مؤسس قرار پائے[۱]۔

امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کی بارگاہِ فیض سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس پر تا زندگی ممنون رہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''میں نے جو کچھ امام محمدؒ سے پڑھا، سنا، نقل کیا اور لیا وہ بارِ شتر کے برابر ہے''۔

امام محمدؒ بھی امام شافعیؒ کا بہت خیال فرماتے تھے، ابوالحسن زیادی بیان کرتے ہیں کہ:

''میں نے دیکھا کہ جو برتاؤ امام محمدؒ صاحب کا شافعیؒ کے ساتھ ہے وہ کسی اور اہل علم کے ساتھ نہیں ہے''[۲]۔

ـ امام ابو یوسف سے ملاقات نہ ہوسکی تھی کیوں کہ امام موصوف کا ۱۸۲ھ میں انتقال ہو چکا تھا، امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ پر محدث بیہقیؒ وغیرہ نے جو الزامات عائد کئے ہیں حافظ ابن حجر نے ''توالی التاسیس''، ص ۷۱ پر اور علامہ کوثری نے ''بلوغ الأمانی''، ص ۲۸ تا ۳۵ پر تردید کی ہے۔

[۱] حیاۃ الشافعی از أبوزہرہ ص ۲۴۶ [۲] تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۰۶

رحلت علمی بغداد سے امام شافعیؒ مکہ معظّمہ واپس آئے اور حرم میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، اسی زمانے میں احمد بن حنبلؒ ان سے ملے، یہ وہ زمانہ تھا کہ شافعیؒ فقہ جدید کے بانی کی حیثیت سے نمایاں ہورہے تھے، اس مرتبہ تو تقریباً نو سال مکہ معظّمہ میں قیام رہا، لیکن اس عرصہ میں انہوں نے اجتہاد واستنباط کے جو اصول وضع کئے تھے اور جو ضوابط تیار کئے تھے، ضروری تھا کہ وہ جمہور فقہاء کے سامنے پیش کریں، عراق اس وقت اہل الرائے اور اہل الحدیث کا مرکز تھا اس لئے دوسری مرتبہ ۱۹۵ھ میں بغداد پہونچے، اب وہ اس طرح آئے کہ فقہاء کی رہبری کے لئے ایک راستہ پیدا کرلیا تھا، اس لئے علماء و طالبان فقہ وحدیث سبھی ان کے گرد جمع ہوگئے، یہیں پر اپنی مشہور کتاب ''الرسالہ'' تصنیف کی، اس دوسرے سفر میں دو سال بغداد میں قیام رہا، پھر ۱۹۸ھ میں تیسری بار بغداد آئے لیکن اس مرتبہ صرف ایک ماہ کے بعد ہی مصر کا عزم کرلیا اور ۱۹۹ھ میں مصر پہونچ گئے۔

امام شافعیؒ کا مصر میں قیام اب امام صاحبؒ کی فکری نمو مکمل ہوچکی تھی، مصر پہونچ کر انہوں نے اپنے آراء وافکار پر نظر ثانی کی اور بعض سے رجوع کیا اور بعض نئے آراء کو قائم کیا، قول جدید سے مراد یہیں کا قول ہے اور قول قدیم یہاں سے پیشتر کا قول ہے، چنانچہ امام شافعیؒ نے خود فرمایا:

''میں اپنی بغدادی تصنیفات کی روایت کی اجازت نہیں دیتا'' [۱]۔

علامہ نووی فرماتے ہیں "**إن قوله القديم مرجوع عنه فلا يصح نسبته إليه** [۲]'' یعنی امام شافعیؒ نے اپنے قول قدیم سے رجوع کرلیا ہے اس لئے ان کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں ہے۔

---

[۱] حیاۃ الشافعی ص ۱۵۵ [۲] شرح مسلم ج ۱ ص ۷

وفات رجب ۲۰۴ھ میں اپنے اصحاب وتلامذہ کی ایک جماعت چھوڑ کر امام صاحبؒ چون (۵۴) سال کی عمر میں اس دارِفانی سے رخصت ہوئے، مصر میں مزار ہے [۱]۔

شیوخ وتلامذہ صدرالائمہ مکی نے امام صاحبؒ کے شیوخ کی تعداد اسی (۸۰) بتائی ہے [۲]، حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حدود سفر میں حسب ذیل مقامات کے نام لئے ہیں، مدینہ، یمن، عراق اور مصر، اس لئے ان کے شیوخ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے، البتہ سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد زنجی، امام مالکؒ، امام محمدؒ، ابن ابی ذئب وغیرہ زیادہ مشہور ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''توالی التاسیس'' مدرسہ عبداللہ بن عباسؓ جس کا سلسلہ مکہ معظّمہ میں قائم تھا، امام شافعیؒ نے اس سے پوری طرح استفادہ کیا۔

تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، ان میں ایک جماعت وہ ہے جس نے بغداد یا مکہ معظّمہ میں ان سے استفادہ کیا، جیسے ابو الولید موسیٰ بن جارود، ابوعلی الزعفرانی، امام احمد واسحاق بن راہویہ وغیرہ ہیں، ایک جماعت وہ ہے جو ان سے مصر میں مستفید ہوئی، جیسے امام مزنی، ربیع المرادی، بویطی، حرملہ اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ ہیں، یہ حضرات امام شافعیؒ کے مذہب جدید کے راوی ہیں اور ان لوگوں نے امام شافعیؒ کے بعد ان کے علوم کو مرتب ومدون کیا [۳]۔

تصنیفات امام شافعیؒ کی بہت سی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، امام بیہقی نے ان کی تعداد ۱۲۸؍ بتائی ہے [۴]، جس میں ''الرسالۃ'' اور ''کتاب الأم'' اور ''سنن شافعی'' زیادہ مشہور ہیں۔

---

[۱] سیر أعلام النبلاء ج ۱۰ ص ۷۶
[۲] مناقب الإمام أعظمؒ از صدرالائمہ ص ۳۸
[۳] حیاۃ الشافعی ص ۲۴۷
[۴] مناقب الشافعیؒ ج ۱ ص ۲۴۷-۲۵۴

مسند شافعیؒ خود امام شافعیؒ کی تصنیف کردہ نہیں ہے بلکہ کتاب ''الأم'' وغیرہ کتب شافعیؒ سے احادیث کا انتخاب ہے، اس اہم کام کو ابوجعفر محمد بن مطر نیشا پوری نے انجام دیا ہے، چونکہ انہوں نے ابوالعباسؒ اصم (جو بیک واسطہ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں) کے حکم سے انتخاب کیا تھا، اس لئے مؤلف کی حیثیت سے ابوالعباس ہی مشہور ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ انہیں کا انتخاب ہے، ابوجعفر صرف کاتب تھے [۱]، بہر حال ''مسند شافعی'' نہ مسانید کی ترتیب پر ہے اور نہ ابواب پر، بلکہ کیف ما اتفق انتخاب ہے اس لئے بکثرت تکرار ہے [۲]۔

''مسند شافعی'' میں ۱۱۹۰ روایات مکررات کی ہیں، اور مکررات کو حذف کر کے ۸۲۰ حدیث مسند و مرفوع اور ۱۲۰ مرسل، منقطع و معضل روایات ہیں [۳]۔

صاحب ''کشف الظنون'' [۴] بیان کرتے ہیں کہ امیر سنجر بن عبداللہ علم الدین جاولی نے اس کو مرتب کیا ہے، ابن الأثیر الجزری (م ۶۰۶ھ) نے اس کی شرح لکھی ہے، اس کا نام رکھا ہے، ''**كتاب شافي العيّ في شرح مسند الشافعي**'' یہ کتاب ۵ جلدوں میں ہے، شیخ زین الدین حلبی نے اس کا انتخاب کیا ہے، اس کا نام ہے، ''**المنتخب المرضي من مسند الشافعي**'' علامہ رافعی (م ۶۲۳ھ) نے دو جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے، علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی شرح ہے، ''**شافي العيّ على مسند الشافعي**'' [۵]۔

علامہ سندی المتوفی ۱۱۹۱ھ نے مسند شافعی کو مرتب کیا اور اس کا نام ''ترتیب

---

[۱] بستان وتدریب ص ۵۷ [۲] مقدمہ تحفۃ الأحوذی ص ۱۷۹ [۳] تدریب الراوی ص ۱۰۲
[۴] مقدمہ ص ۱۶۸۳ [۵] مقدمہ تحفۃ الأحوذی ۱/۱۴۲

مسند الإمام أبي عبدالله الشافعي"رکھاعلامہ نے"مسند شافعی" کی روایات کی تعداد۱۷۲۱بتائی ہے یہ کتاب بیروت سے طبع ہوچکی ہے۔

امام شافعیؒ وعلم حدیث اوپر گزر چکا ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنے دور کے تمام مراکز سے استفادہ کیا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب علم حدیث کی تدوین ہوچکی تھی، فقہ حنفی و فقہ مالکی ان احادیث وآثار کی روشنی میں مدون ومکمل ہوچکی تھی جن پر صحابہ وتابعین کا تعامل تھا، اب تک عام طور پر مصنفین اپنی کتابوں میں احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہؓ و تابعین کے اقوال بھی درج کرتے تھے، مگر امام شافعیؒ کے دور میں یہ طرز بدل گیا، اب تک علماء مسند ومرسل دونوں سے استدلال کرتے تھے مگر اس عہد میں اس سے اختلاف کیا گیا، امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں:

إن التابعين أجمعوا بأسرهم	یعنی تابعین سارے کے سارے
علىٰ قبول المرسل ولم يأت	مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے
عنهم إنكاره ولا عن أحد من	نہ تو ان سے اور نہ ان کے بعد کسی
الأئمة بعدهم إلى رأس	امام سے ۲۰۰ھ تک اس کا انکار
المأتين[۱].	ثابت ہے۔

لیکن امام شافعیؒ نے مرسل حدیث سے استدلال کرنے کے بارے میں اختلاف کیا[۲]، مرسل کا انکار فی الواقع احتیاط کے پیش نظر کیا گیا تھا، مگر جہاں مرسل کے علاوہ کوئی اور مسند روایت نہیں تھی وہاں مرسل سے بھی احتجاج کیا ہے۔

امام شافعیؒ کے زمانے میں ہر نادر نوشتے اور غیر متداول صحیفے کی تلاش کی گئی

---

[۱] منیۃ الالمعی ص ۲۷/ از حافظ قاسم بن قطلوبغا [۲] توجیہ النظر ص ۱۵۲

اور حجاز وعراق، شام ومصر اور بلاد اسلامیہ کے افراد وغرائب، شخصی وخاندانی روایات یا کسی غیر مشہور صحابی کی حدیث جن کو ان سے ایک ہی شخص روایت کرتا چلا آیا ہو، یہ سب جمع ہوگئیں تھیں، ان مجموعوں میں بعض ایسی روایات سامنے آئیں جن پر صحابہؓ و تابعین اور سلف کا تعامل نہ تھا، عام اہل فتویٰ ان کے شاذ ومتروک العمل ہونے کی وجہ سے ان کو نا قابل استدلال سمجھتے تھے، امام شافعیؒ نے ان سے اختلاف کیا کیوں کہ صحابہ وتابعین ہر مسئلے میں حدیث تلاش کرتے تھے، جب کوئی روایت نہ ملتی تو دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرتے اس لئے امام شافعیؒ نے ایسی تمام روایات کو معمول بہا قرار دیا، مثلاً قلتین کی حدیث اگلے طبقہ میں شائع نہ تھی مگر اس دور میں اس کی اشاعت ہوئی، اس لئے امام شافعیؒ نے اس پر اپنے مذہب کی بنا رکھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

فلم يظهر الحديث في عصر سعيد بن المسيب، ولا في عصر الزهري، و لم يمش عليه المالكية ولا الحنفية، فلم يعملوا به ۱؎.	قلتین کی حدیث نہ سعید بن مسیّب کے عہد میں ظاہر ہوئی نہ زہری کے زمانہ میں نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ حنفیہ، چنانچہ ان سب لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

علامہ ابن قیم نے ''تہذیب السنن'' میں اس حدیث کے شذوذ پر تفصیلی بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

''پس یہ سنت عظیم المرتبت اگر حضرت ابن عمرؓ کے پاس ہوتی تو ان

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۷

کے اصحاب اور اہل مدینہ سب لوگوں سے زیادہ اس کے ناقل ہوتے اور سب سے زیادہ اس کو روایت کرتے، سواس سے بڑھ کر اور کیا شذوذ ہوسکتا ہے جب کہ اصحاب ابن عمرؓ سے کوئی ایک فرد بھی اس تحدید کا قائل نہیں (یعنی پانی کی تحدید) تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اس کے متعلق کوئی سنت آنحضرت ﷺ سے موجود نہ تھی اور یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے"۔[۱]

اسی طرح خیار مجلس کی حدیث پر نہ فقہاء سبعہ نے عمل کیا اور نہ ان کے معاصرین نے، پس یہ علت قادحہ ہے، امام مالکؒ وابوحنیفہؒ کے نزدیک، مگر امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

چونکہ امام شافعیؒ کے دور میں اقوال صحابہ جمع ہو چکے تھے اس لئے جو اقوال و فتاوے ان روایات کے خلاف تھے انہیں نہ تسلیم کرتے ہوئے صاف کہہ دیا "هم رجال و نحن رجال"۔[۲]

امام شافعیؒ نے جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور امتیاز مراتب کے قواعد مرتب کئے، انہوں نے اپنی کتاب "الأم" اور "الرسالہ" وغیرہ میں بکثرت روایات سے استدلال کیا ہے جس سے حجیت حدیث اور شریعت اسلامیہ میں حدیث

---

[۱] تہذیب سنن أبی داود ص ۸۵ (برحاشیہ غایۃ المقصود) [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۴۷
حافظ ابن القیم نے "إعلام الموقعین" میں امام شافعی کی طرف اس قول کے انتساب کو غلط بتایا ہے۔
(امام شافعی ص ۳۰۱)

کے درجے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، زعفرانی کہتے ہیں کہ اصحاب حدیث خوابیدہ تھے، امام شافعیؒ نے بیدار کیا، امام محمدؒ نے یہ سند عطا کی:

إن تـكـلم أهل الحديث يوما اگر کسی روز اصحاب حدیث کلام
فبلسان الشافعيؒ. کریں گے تو امام شافعیؒ کی زبان
میں۔

امام احمد فرماتے ہیں کوئی ایسا محدث نہیں ہے جس نے قلم و دوات کو ہاتھ لگایا ہو مگر شافعیؒ کا اس کی گردن پر احسان نہ ہو، ہمیں مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ حدیث کا علم نہیں ہوا یہاں تک کہ ہم امام شافعیؒ کی مجلس میں بیٹھے[۱]۔

امام احمد کی نظر میں امام شافعیؒ دوسری صدی کے مجدد ہیں[۲]۔

البتہ امام شافعیؒ نے کوئی درس حدیث کی باقاعدہ مجلس نہیں قائم کی، کیوں کہ وہ امام و مجتہد تھے، وہ حدیث پر اصولی حیثیت سے گفتگو کرتے تھے اور حدیث کو استنباط و استخراج مسائل کے لئے تلاش کرتے تھے مگر تاریخ حدیث میں ان کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱؎ ابن خلکان ج۳ ص۳۵ ۲؎ توالی التاسیس ص۳۹ و حسن المحاضرہ ص۱۶۶

امام احمد بن حنبلؒ

نام ونسب اورابتدائی حالات نام ہے احمد بن محمد بن حنبل شیبانی مروزی، کنیت ابوعبداللہ، وہ خالص عربی النسل اورقبیلہ شیبانؔ میں سے تھے، امام احمد کی والدہ مرو سے بغداد آئیں تو وہ پیٹ میں تھے، اور وہیں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، تین سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۱۔

بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور زبان کی تعلیم حاصل کی، تقویٰ وطہارت، نجابت وصلاحیت کے آثار ابتدا ہی سے نمایاں تھے، انہیں آثار کو دیکھ کر ان کے زمانے کے ایک صاحب نظر (ہیثم بن جمیل) نے کہا تھا اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا۲۔

بغداد جسے امام صاحب کے مولد ومدفن ہونے کا شرف حاصل ہے خلافت عباسیہ میں بہت بڑا علم وفن کا مرکز تھا، جس کو محدث حاکم نیشاپوری، ''مدینۃ العلم وموسم العلماء والأفاضل'' فرماتے ہیں۳، بغداد میں علم حدیث کی نشرواشاعت کا یہ حال تھا

ؔ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار مثنیٰ بن حارثہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۶، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۷، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۷۲ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۱ ص ۱۷۷ ۲۔ تاریخ اسلام از ذہبی ترجمہ احمد بن حنبل، وسیر أعلام النبلاء ج ۱۱ ص ۱۹۵

۳۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۴

کہ ایک ایک محدث کے حلقۂ درس میں عام طور پر ہزاروں طلباء کا ہجوم ہوتا تھا۔

تحصیل علم | بغداد کے محدثین میں امام ابو یوسف کی یہ شان ہے کہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل حدیث شروع کی تو سب سے پہلے امام ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے حدیثیں لکھیں[۱]، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث ہشیم بن بشیر بن ابو حازم الواسطی (م ۱۸۳ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثناء میں بغداد کے دیگر محدثین سے بھی استفادہ کیا[۲]۔

بغداد سے فارغ ہوکر کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا[۳]۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ہوئی، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعیؒ حدیث کے صحت وسقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے کہ اگر تم محدثین کے یہاں حدیثیں صحیح ہوں تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد کے مجتہد وفقیہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، مگر ان پر حدیث کا رنگ غالب تھا، انہوں نے جریر بن عبدالحمید محدث سے حدیث سننے کے لیے رَے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے، اس بلند ہمتی وکثرت اسفار اور فطری وغیر معمولی حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعت علم اور کثرت حفظ کے باوجود امام شافعیؒ کی شخصیت سے

---

[۱] مناقب الإمام أحمد لابن الجوزي ص ۲۲ و ۲۳ [۲] مناقب امام احمد ص ۴۸

[۳] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۰۱

متاثر تھےاور کہتے تھے" ما رأت عيناي مثله"،انہوں نے امام شافعیؒ سے اجتہاد کے اصول سیکھےاوراس کا ملکہ اخذ کیااور بالآ خروہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، ان کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعیؒ بھی ان کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

خرجت من بغداد وما	میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں اس
خلفت بها اتقیٰ ولا أفقه من	حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے
أحمد بن حنبل[۱].	بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ۔

امام احمد کو امام شافعیؒ سے "موطأ" کا سماع بھی حاصل ہے[۲]۔

مجلس درس چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۰۴ھ میں انہوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انہوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے، علوم نبوت کی اشاعت شروع کی[۳]، ابتدا ہی سے ان کے درس میں سامعین و طالبین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سوصرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کی مجلس درس بڑی سنجیدہ اور باوقار ہوتی تھی[۴]۔

زہد وتقویٰ امام صاحبؒ کی زندگی زہد وتوکل میں یکتائے روزگار تھی، انہوں نے کبھی سلاطین زمانہ اور خلفاء کا عطیہ قبول نہیں فرمایا، مامون، معتصم اور واثق کا دوران کے لیے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ یہ تینوں ان کے درپئے آزار تھے اور متوکل کا

۱۔ حوالۂ مذکور و تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۸ ۲۔ تدریب ص۳۴
۳۔ احمد بن حنبل از أبوزہرہ ص۳۷ ۴۔ حلیۃ الأولیاء ج۹ ص۱۶۵

دوراس لیے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا نہایت عقیدت منداور قدرداں تھا، چنانچہ امام صاحبؒ نے متوکل کے حکم سے چندروز اس کے لشکر میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ پُر تکلف کھانا آتا جس کی قیمت کا اندازہ ایک سوبیس درہم روزانہ تھا، انہوں نے اس کھانے کو کسی روز چکھا تک نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے تھے، آٹھ روز تک امام صاحب نے روزہ پر روزہ رکھے یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو زندگی ان کے لیے مشکل تھی[۱]۔

تواضع ومسکنت | مسئلہ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام ان کی شہرت سے معمور تھا اور ہرطرف ان کی تعریف اور دعا کا غلغلہ تھا، مگر وہ برابر خائف رہتے اوران کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا۔

ان کو جوذاتی کمالات اوراوصاف خدا کی طرف سے عطا کئے گئے تھے اس کی بنا پر کبھی اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوا، ان کے ساتھی یحیی بن معین کہتے ہیں:

ما رأيت مثل أحمد بن حنبل،	میں نے امام احمد جیسا نہیں دیکھا،
صحبته خمسين سنة ، ما	میں پچاس برس ان کے ساتھ رہا
افتخر علينا بشئ مما كان فيه	ہوں انہوں نے کبھی ہمارے سامنے
من الصلاح والخير[۲].	اپنی صلاح وخیر پر فخر نہیں کیا۔

شیوخ وتلامذہ | حافظ ابن جوزی نے ان کے شیوخ کی تعداد سو سے زائد بتائی ہے جیسے قاضی ابویوسف، ہشیم بن بشیر بن حازم، وکیع ، یحیٰی بن سعید قطان، سفیان بن عیینہ وامام شافعی وغیرہم۔

---

[۱] اختصار طبقات الحنابلہ ج۱ص۲۵ [۲] حلیۃ الأولیاء ج۹ص۱۸۱

ان شیوخ کی تعداد جن سے ''مسند'' میں روایت کیا ہے ۲۸۰ سے زیادہ ہے۔

تلامذہ کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں بخاری ومسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ، مطین وعبداللہ بن احمد ''وخلق عظیم'' اور ایک بڑی خلقت ''خلق عظیم'' کے لفظ سے معلوم ہوا کہ ان کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے جس میں بڑے بڑے ائمہ فن داخل ہیں ۱۔

وفات کا حال | امام صاحبؒ نے ۷۷ سال کی عمر پائی، ۹ روز بیمار رہے، عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازے اور گلی میں پہرہ لگادیا اور وقائع نگار متعین کردیئے گئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بدم بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ گلی بند کردی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، بازار میں خرید وفروخت مشکل ہوگئی تھی، امام صاحبؒ کے پیشاب میں خون آنے لگا تھا، طبیب سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم وفکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے، جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا تو انہوں نے تکلیف ہی کی حالت میں مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤ، شب جمعہ میں حالت زیادہ خراب ہوگئی، ۱۲؍ربیع الاول ۲۴۱ھ کو امام سنت نے انتقال کیا، اس پر سارا شہر امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم دیکھنے میں نہ آیا تھا، نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں ۲۔

امام احمدؒ ابتلاء وامتحان میں | جب معتزلہ نے عقیدۂ خلق قرآن کو کفر وایمان کا معیار بنادیا، اتفاقاً مذہب اعتزال کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی، مامون اس مسئلہ کا پُر جوش داعی اور مبلغ بن گیا، ۲۱۸ھ میں مامون نے والی بغداد اسحاق بن

---

۱ تذکرہ ج ۲ ص ۴۳۱ ۲ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۴ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۶۴

ابراہیم کے نام مفصل فرمان بھیجا جس میں عام مسلمین بالخصوص محدثین کی جو اس عقیدہ کو قرآن مجید کی عظمت کے منافی سمجھتے تھے، سخت مذمت کی اور حقارت آمیز تنقید کی اور انہیں شرار امت قرار دیا[۱]، اس فرمان کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں، اس فرمان کے بعد اسحاق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور مشاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی اور ان کے جوابات کو بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا، ان میں سے دو کے قتل کا حکم دیا اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو ان کو ان کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ ان علماء کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں مامون کے پاس روانہ کر دیا گیا، جب یہ لوگ مقام ''رقہ'' پہونچے تو مامون کے انتقال کی خبر ملی، مامون نے اپنے جانشین معتصم کو وصیت کی تھی کہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک اور عقیدہ پر قائم رہے چنانچہ اس نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔

اب حکومت وقت کے مقابلے کی تنہا ذمہ داری امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے، امام صاحب کو ''رقّہ'' سے بغداد لایا گیا، اور تین دن تک اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا اور ہر طرح ڈرایا اور دھمکایا گیا، اس کے بعد امام صاحب کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ دم جلاد صرف دو کوڑے لگاتا، پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا، امام احمدؒ ہر کوڑے پر فرماتے:

---

[۱] امام احمدؒ کے مجددانہ کارنامے کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' حصۂ اول از ص ۸۴ تا ص ۱۰۲

أعطوني شيئا من كتاب الله أو سنة رسوله حتى أقول به.	میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت میں سے کوئی دلیل پیش کرو تا کہ میں اس کو مان لوں۔

امام احمد کو ۲۸ ہفتے قید خانہ میں رکھا گیا، اور اس عرصہ میں ان کو ۳۴ کوڑے لگائے گئے [۱]۔

محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو لگتا تو چیخ مار کر بھاگتا، امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور امت اسلامیہ ایک بہت بڑے دینی خطرے سے محفوظ ہو گئی ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز دین کی حفاظت کے لیے اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تنہا مقابلہ ہے۔

علی بن مدینی جو مشہور محدث اور امام بخاری کے مایۂ ناز استاذ ہیں جنہوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی فرماتے ہیں کہ:

إن الله أعز هذا الدين برجلين ليس لهما ثالث، أبو بكر الصديق يوم الرِدّة، و أحمد بن حنبل يوم المحنة.	اللہ تعالیٰ نے اس دین کے غلبہ وحفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا جن کا تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ [۲]۔

تصنیفات | کتاب الزھد، ط، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المناسک الکبیر،

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۵ [۲] تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۴۱۸

کتاب المناسک الصغیر، کتاب حدیث شعبہ، کتاب فضائل الصحابہؓ ط، مناقب صدیق اکبرؓ وفضائل اہل بیت، کتاب الایمان، ط، کتاب الفضائل، ط، وکتاب الأشربۃ، ط، تاریخ، تفسیر، مسند وغیرھا[1]، یہ مسندان کی تصنیفات میں بہت بڑا علمی وتصنیفی کارنامہ ہے جس کا ہم آئندہ صفحات میں تفصیلی تعارف کرارہے ہیں۔

مسانید کی تصنیف کا آغاز | دوسری صدی تک علماء اپنی کتابوں میں حدیث نبویؐ کے ساتھ آثار صحابہؓ وتابعین کو درج کرتے تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ذالک علیٰ رأس المأتین.	یعنی مسند کی تصنیف کا آغاز ۲۰۰ھ کے ختم پر ہوا[2]۔

مگر اس دور میں طریقۂ تصنیف بدل گیا، حدیث نبویؐ کو آثار سے علیحدہ کر کے جمع و تالیف کا اہتمام کیا گیا اور مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا، اور بہت سے ائمہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسند پر کتابیں لکھیں، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

فقلّ إمام من الحفاظ إلا وصنف حدیثه علی المسانید، کأحمد بن حنبل، و إسحاق بن راهویه، و عثمان ابن أبي شیبة وغیرهم.	حفاظ حدیث میں شاید ہی کوئی امام ہو جس نے مسند کی ترتیب پر اپنی احادیث کو نہ مرتب کیا ہو جیسے احمد ابن حنبل واسحاق بن راہویہ وعثمان ابن ابی شیبہ وغیرہم[3]۔

مسانید وابواب کا فرق | ہر صحابی کی جملہ روایات کو بلا لحاظ مضمون یکجا بیان کر دیا

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۸۰، وفہرست ابن الندیم ص ۲۸۵، وأعلام المحدثین ص ۱۲۵، ۱۲۶

[2] تدریب ص ۴۰ [3] مقدمۂ فتح الباری ص ۶، وتدریب الراوی ج ۱ ص ۸۹

جا تا ہے اور ابواب میں احادیث کو باب وار مضامین کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا ہے، حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ حدیث کی تصنیف کے دو طریقے ہیں یا تو فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا جائے جیسے ''صحاح ستہ''، یا مسانید کے طریقہ پر تصنیف کی جائے یعنی ہر صحابی کے ترجمہ میں اس کی صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا جائے، مسند کے لکھنے میں کبھی حروف تہجی کا اعتبار کیا جاتا ہے، کبھی قبائل پر ترتیب دی جاتی ہے اور کبھی اسلام میں سبقت کا لحاظ ہوتا ہے [۱]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں:

''أصل وضع التصنيف للحديث على الأبواب أن يقتصر فيه علىٰ ما يصلح للاجتهاد أو للاستشهاد، بخلاف من رتب على المسانيد، فإن أصل وضعه مطلق الجمع'' [۲].

ابواب پر حدیث کی تصنیف کا ضابطہ یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جائے جو استدلال و استشہاد کی صلاحیت رکھتی ہوں برخلاف مسانید پر جن لوگوں نے مرتب کیا ہے ان کا مقصد صرف جمع روایات ہے۔

چونکہ مسند میں ہر طرح کی پراگندہ روایات کو جمع کر دیا جاتا ہے اس لیے اس میں صحیح و ضعیف ہر طرح کی روایات موجود ہوتی ہیں، اب اہل فن کا کام ہے کہ وہ اصول تنقید و قواعد روایت پر جانچ پڑتال کر کے ہر روایت پر صحیح رائے قائم کریں، متأخرین کے لیے مسند سے روایت کی تخریج میں دشواری معلوم ہوتی ہے مگر علماء سلف جن کی قوت حافظہ کا تذکرہ گزر چکا ہے، انہیں اس میں کوئی زحمت نہیں تھی۔

---

[۱] مقدمۂ لامع الدراری ص ۱۴۷ بحوالہ تدریب   [۲] تعجیل المنفعہ ص ۳

مسند احمد کی تالیف | امام احمد سولہ سال کی عمر سے علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہوئے اسی زمانے سے جمع روایات کی ابتدا کر دی تھی، گویا ۱۸۰ھ سے تصنیف کا آغاز کیا[۱]، اور اخیر زندگی تک اس میں مشغول رہے یہاں تک کہ جب زندگی کا وقت قریب ہوا تو اس مسودے کو اسی حالت میں اپنے عزیزوں کو سنایا، آپ کے برادرزادہ حنبل بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ عم محترم نے مجھے اور اپنے دونوں صاحبزادگان صالح وعبداللہ کو جمع کر کے ہمارے سامنے ''مسند'' کی قرأت کی، ہمارے سوا اور کسی نے آپ سے اس کتاب کو بہ تمام وکمال نہیں سنا ہے پھر ہم سے فرمایا کہ میں نے اسے ساڑھے سات لاکھ ؎ سے زائد احادیث سے جمع وانتخاب کیا ہے، پس رسول اللہ ﷺ کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کرو، اگر وہ روایت اس میں مل گئی تو فبہا ورنہ حجت نہیں[۲]، یاد رہے کہ ''مسند'' میں کسی حدیث کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ امام احمد کا اس پر عمل بھی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | امام ممدوح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی حدیث ''مسند'' میں موجود نہ ہو تو وہ حجت نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کی ایک بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

قد قيل: إنه لم يقع له جماعة من الصحابة الذين في "الصحيحين" قريباً من مأتين[۳].	کہا گیا ہے کہ قریباً دو سو صحابہؓ کی روایات اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں جن سے ''صحیحین'' میں حدیثیں منقول ہیں۔

---

[۱] احمد بن حنبل از شیخ أبو زہرہ ص ۱۵۹

[۲] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۳ ص ۳۱

؎ یہ تعداد متون کی نہیں اسانید وطرق کی ہے۔

[۳] اختصار علوم الحدیث ص ٦

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ ارشاد غالب حال کے لحاظ سے ہوسکتا ہے [۱]، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تحریر فرماتے ہیں:

''راقم الحروف می گوید مراد ایشاں ہماں است کہ بدرجہ تواتر شہرت نہ رسیدہ اندوالا احادیث صحیحہ مشہورہ بسیار است کہ در مسند ایشاں نیست'' [۲]۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ امام صاحب کی مراد وہ احادیث ہیں جو تواتر یا شہرت تک نہ پہونچی ہوں، ورنہ بہت سی احادیث صحیحہ مشہورہ ایسی ہیں جو ان کی ''مسند'' میں موجود نہیں۔

مسند کی ترتیب امام احمد اپنی زندگی میں اس کی ترتیب وتبویب نہیں کر سکے تھے حافظ شمس الدین جزری فرماتے ہیں:

''امام احمدؒ نے مسند کو متفرق اوراق میں لکھا تھا اور مختلف اجزا میں پھیلا رکھا تھا، جیسے کہ مسودہ ہوتا ہے، اس کی تنقیح وتہذیب سے پہلے انتقال ہوگیا، کتاب اسی حال میں رہ گئی'' [۳]۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ:

''مسند'' کی موجودہ ترتیب امام صاحبؒ کے صاحبزادے عبداللہ کی ہے لیکن اس میں بہت سی غلطیاں

---

[۱] المصعد لأحمد ص ۲۱ [۲] بستان ص ۳۰ [۳] مقدمہ المسند بہ تحقیق احمد شاکر ص ۳۵

ہوئی ہیں، مدنیوں کو شامیوں میں اور کبھی اس کے برعکس
درج کردیا ہے'' ۱؎۔

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام صاحب نے اس کو مرتب ومہذب کیا ہوتا تو یہ کام بہت اعلیٰ پیمانے پر انجام پاتا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے امید ہے کہ شاید کسی بندے کو اس کارِ عظیم کی توفیق عطا فرمائے ۲؎۔

بعد کے بہت سے علماء نے اس کی ترتیب وتبویب کی کوشش کی، بعض کا کام مکمل ہوا، شیخ علی بن حسین بن عروہ بن زکنون المتوفی ۸۳۷ھ نے ''مسند'' کو ابواب بخاری پر مرتب کر کے شرح لکھی ہے جو ۱۲۰ر جلدوں میں ہے، دمشق وقاہرہ کے کتب خانوں میں کچھ جلدیں اس کی موجود ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے "**إطـــــراف الـمسـند المعتلي بأطراف المسند الحنبلي**" کے نام سے شرح لکھی ہے، جو دس جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اور بعض کا ناقص رہ گیا، مگر افسوس کہ وہ سب کتابیں نایاب ہیں، حافظ ابوالحسن ہیثمی نے ''مسند'' کی ان روایات کو جو ''صحاح ستہ'' سے زائد ہیں، ابواب کی ترتیب پر ''مجمع الزوائد'' میں جمع کیا ہے، ابوالحسن بن الہادی سندی (م ۱۱۳۹ھ) نزیل مدینہ منورہ نے اس پر حاشیہ لکھا ہے، جو قطر سے ۱۸ر جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، بہت سے علماء نے ''مسند'' کا اختصار بھی کیا ہے، علامہ سیوطی نے مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، اس کا نام "**عقود الزبرجد علی مسند أحمد**" رکھا ہے، یہ بھی طبع ہوچکی ہے۔

موجودہ زمانے میں احمد بن عبدالرحمٰن البنا مرحوم نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے ان کی کتاب کا نام ہے ''الفتح الربانی لترتیب مسند احمد بن حنبل الشیبانی'' جو

۱؎ بستان ص ۲۶ ۲؎ امام احمد بن حنبل ص ۱۶۲ر از شیخ اَبوزہرہ

تکملہ کے ساتھ چھپ چکی ہے، شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی ترتیب وتحقیق کی ہے، جو چھپ گئی ہے، تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا بعد میں تکمیل کی گئی۔

تعداد روایات ''مسند'' میں تقریباً سات سو صحابہؓ کی روایات ہیں، روایات کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے، اور عبداللہ کی زوائد کا شمار کر کے چالیس ہزار تعداد بتائی گئی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مکررات کے ساتھ یہ تعداد مراد ہو۔

زوائد مسند شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''مسند'' میں امام صاحبؒ کے صاحبزادے عبداللہ نے اضافے بھی کئے ہیں، اسی طرح عبداللہ سے روایت کرنے والے ابوبکر قطیعی نے بھی اضافہ کیا ہے ۱؎، عبداللہ نے اکثر اضافے امام صاحب سے سنی ہوئی روایات کے کئے ہیں، یہی اصل مسند ہے، کچھ دیگر شیوخ کی تعداد کا اضافہ بھی کیا ہے مگر ان کی تعداد کم ہے ۲؎۔

مسند میں تخریج روایات کی شرط صاحب ''کشف الظنون'' لکھتے ہیں:

ذكروا أن أحمد بن حنبل شرط فيه أن لا يخرج إلا حديثا صحيحا ۳؎.	لوگوں نے بیان کیا ہے کہ امام احمدؒ نے اپنی ''مسند'' میں صرف صحیح حدیثوں کی تخریج کو شرط قرار دے رکھا ہے۔

لیکن امام صاحب نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا کہ میں نے ''مسند'' میں حدیث مشہور کا قصد کیا ہے، اور لوگوں کو اللہ کے پردے کے تحت چھوڑ دیا ہے، اگر میں صرف احادیث صحیحہ جو میرے پاس ہیں انہیں کو درج کرتا تو ''مسند'' میں روایات کی تعداد بہت کم ہوتیں، میرے بیٹے! تم حدیث میں میرے طریقے سے واقف ہو کہ میں حدیث

۱؎ طبقات الشافعیہ ج۲ص۳۲ ۲؎ بستان ص۲۹ ۳؎ کشف الظنون ج۲ص۴۳۰

ضعیف کی مخالفت نہیں کرتا الا یہ کہ باب میں (اس سے قوی روایت) معارض ہو [۱]۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ''مسند'' کی شرط ابوداود کی شرط سے قوی ہے جو انہوں نے اپنی ''سنن'' میں اختیار کر رکھا ہے، چنانچہ ابوداود نے اپنی ''سنن'' میں ایسے لوگوں سے روایت کی ہے جن سے ''مسند'' میں اعراض کیا گیا ہے [۲]۔

''مسند'' میں کسی راوی کی روایت درج ہونے کے بعد اگر راوی یا روایت کا غیر معتبر ہونا معلوم ہوتا تو اس کو امام صاحبؒ چھانٹ دیتے تھے، تا دم زیست مسودہ میں حذف وترمیم فرماتے رہے [۳]۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ''مسند'' کو طبقۂ ثانیہ کی کتب کے قریب بتایا ہے [۴]۔

مسند کی بعض خصوصیات (۱) حدیث کا اتنا بڑا اور کوئی مجموعہ نہیں۔

(۲) اس میں قریباً تین سو ثلاثی روایات ہیں۔

(۳) حافظ شمس الدین جزری لکھتے ہیں:

''ما من حديث غالباً إلا وله أصل في هذا ''المسند'' والله أعلم [۵].	کوئی حدیث غالبًا ایسی نہ ہو کہ جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو، واللہ اعلم۔

(۴) دیگر مسانید سے صحیح تر ہے۔

مسند پر ابن جوزی وغیرہ کے اعتراضات علامہ ابن الجوزی وحافظ عراقی نے مجموعی طور پر ''مسند'' کی ۳۸ روایات کو موضوع قرار دیا ہے جیسا کہ حافظ سیوطی نے ''التعقبات على الموضوعات'' کے آخر میں تحریر فرمایا ہے، اور ان سب کا جواب بھی دیا ہے۔

---

[۱] احمد بن حنبل ص ۱۶۴ [۲] توجیہ النظر ص ۱۵۴

[۳] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ [۴] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ [۵] تدریب ص ۱۰۱

حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اصل ''مسند'' میں بھی چند روایات موضوع درج ہوگئی ہیں، البتہ امام صاحبؒ کے صاحبزادے عبداللہ کے زوائد میں ضعیف وموضوع دونوں طرح کی روایات شامل ہیں[1]۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے ''منہاج السنۃ'' میں وضاحت کی ہے کہ ''مسند'' اور عبداللہ کے زوائد کی کوئی حدیث موضوع نہیں ہے، البتہ ابوبکر قطیعی کے زیادات میں بعض حدیثیں موضوع آ گئی ہیں[2]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ عراقی و ابن جوزی کے اعتراضات کے جواب میں مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام رکھا ہے، ''**القول المسدد في الذب عن المسند**'' جو طبع ہو چکی ہے کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تصنیف عظیم کا دفاع ضروری معلوم ہوا جس کی امت میں مقبولیت وتعظیم ہے، اس کتاب میں ۹/ان روایات کا جواب ہے جن کو حافظ عراقی نے موضوع قرار دیا ہے اور ۱۵/وہ ہیں جن کو ابن جوزی نے کتاب'' الموضوعات'' میں داخل کیا ہے، حافظ سیوطی فرماتے ہیں مگر ۱۴/حدیثیں رہ گئی تھیں اس لیے ان کا جواب میں نے ''الذیل الممہد'' میں لکھ دیا ہے[3]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''مسند'' میں کوئی حدیث بے اصل نہیں سوائے تین یا چار کے مگر احتمال ہے کہ امام احمد نے کاٹ کر نکالنے کی وصیت کی ہو وہ سہواً رہ گئی ہوں، یا کاٹ کر نیچے لکھ دیا ہو، بہر حال اصل کتاب سے ان کا کوئی تعلق نہیں[4]۔

---

[1] تدریب ص ۹۹، ۱۰۰ [2] توجیہ النظر ص ۱۵۴

[3] تدریب ص ۱۰۱ [4] تدریب الراوی ج ۱ ص ۱۷۲

امام بخاریؒ

نام ونسب سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بَر دِزبہ، بردزبہ مجوسی تھے اوراسی مجوسیت پر ان کا انتقال ہوا، ان کے صاحبزادہ مغیرہ پہلے شخص ہیں جو امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھوں پر مشرف باسلام ہوئے، اسی نسبت سے امام موصوف جعفی مشہور ہوگئے، ورنہ جعف خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۱؎۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف کے دادا ابراہیم کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہوسکے ۲؎، البتہ امام بخاری کے والد اسماعیل اپنے زمانہ میں طبقۂ رابعہ کے مشہور محدث شمار کیے گئے ہیں، ان کے شیوخ میں امام مالک، حماد بن زید وغیرہ ہیں، لیکن عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے والد اسماعیل نے حماد بن زید کو دیکھا کہ انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا اور انہیں امام مالکؒ سے بھی سماع حاصل ہے، اور عبداللہ بن مبارک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ۳؎۔

پیدائش اور ابتدائی حالات امام بخاری ۱۳ رشوال نماز جمعہ کے بعد ۱۹۴ھ میں

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۷ ۲؎ مقدمۂ فتح الباری ص ۴۷۴

۳؎ مقدمۂ لامع الدراری ص ۲۷

بخارا ہی میں پیدا ہوئے، بچپن میں نابینا تھے لیکن والدہ کی دعا کی برکت سے آنکھیں روشن ہوگئیں، امام صاحب کی والدہ نے جب ان کے لیے دعا کرنا شروع کی تو خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ تمہاری کثرت دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لڑکے کی بینائی واپس کردی، اس خواب کی صبح کو وہ واقعی بینا ہوگئے ۱؎۔

امام صاحب کے والد اسماعیل کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا، اور انہوں نے اپنی والدہ کے آغوش شفقت میں نشو ونما پائی، سولہ سال کی عمر میں امام موصوف نے عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو حفظ کرلیا تھا، پھر اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ساتھ حج کے لیے گئے، بھائی تو بخارا واپس آ گئے اور امام موصوف نے حج سے فراغت کے بعد دوسال مکہ معظّمہ میں قیام فرمایا، پھر اٹھارہ سال کی عمر میں مدینہ منورہ کا رخ کیا، اور وہاں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس چاندنی راتوں میں ''قضایا الصحابہؓ والتابعین'' اور ''التاریخ الکبیر'' تصنیف کی ۲؎۔

سماع حدیث کے لیے سفر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ سے ہوا، انہوں نے سماع حدیث کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، شام مصر اور جزیرہ میں دوبار تشریف لے گئے اور حجاز مقدس میں چھ سال قیام فرمایا، کوفہ و بغداد جو علماء کا مرکز تھا، بار بار گئے، اور بصرہ میں چار مرتبہ جانا ہوا، اور بعض دفعہ پانچ پانچ سال تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظّمہ چلے جایا کرتے تھے، حافظ ابن کثیر

۱؎ مقدمۂ فتح الباری ص ۴۵۸ ۲؎ مقدمۂ فتح الباری ص ۴۷۹

؎ اس کے خلاف جن شروح وحدیث یا کتاب میں ہے وہ غلط ہے، ناسخ کی غلطی ہے یا مؤلف سے فرو گذاشت ہوگئی ہے۔ (مقدمۂ لامع ص ۶)

فرماتے ہیں کہ امام موصوف آٹھ مرتبہ بغداد آئے اور ہر مرتبہ امام احمد بن حنبل بغداد کے قیام پر اصرار کرتے تھے[۱]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود امام صاحب نے امام احمد سے بہت کم روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کو خود امام احمد کے مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا تھا اور اس لیے کہ اخیر سفر میں امام احمد نے روایت کرنا بہت کم کر دیا تھا[۲]، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے سب سے پہلے سماع حدیث ۲۰۵ھ میں شروع کیا اور اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۲۱۰ھ سے انہوں نے سفر کا آغاز کیا، اس سلسلہ میں نیشا پور کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں بھی کچھ دنوں مقیم رہے تھے[۳]۔

اساتذہ وشیوخ امام بخاری کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کا خود بیان ہے:

"کتبت عن ألف و ثمانين نفساً" ليس فيهم إلا صاحب حديث[۴].	میں نے ایک ہزار اسی (۸۰) آدمیوں سے حدیثیں لکھیں، ان میں سب کے سب محدث تھے۔

لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کو اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی سے زیادہ فیض پہونچا تھا۔

حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کے پانچ طبقات قائم کئے ہیں:

(۱) تبع تابعین، مثلاً محمد عبداللہ الانصاری، ابو عاصم النبیل۔

---

[۱] ارشاد الساری ص ۳۱ [۲] مقدمہ لامع ص ۶ بحوالہ فتح الباری

[۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۵۵ [۴] مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹

(۲) تبع تابعین کے وہ معاصر جنہوں نے کسی ثقہ تابعی سے حدیث کی روایت نہیں کی جیسے آدم بن ایاس۔

(۳) امام صاحب کے اساتذہ کا یہ درمیانی طبقہ ہے، اس میں ان لوگوں کا شمار ہے جن کو کبار تبع تابعین سے اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ۔

(۴) معاصرین اور ہم عصر رفقاء، جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوحاتم رازی۔

(۵) وہ معاصرین جو امام صاحب کے تلامذہ کے صف کے تھے، لیکن ان سے بھی بعض مرتبہ انہوں نے روایت کی ہے، جیسے عبداللہ بن حماد آملی وغیرہ۔

ان محدثین سے استفادہ میں امام صاحب نے امام وکیع کے اس مقولہ پر عمل فرمایا ہے کہ آدمی اس وقت تک محدث نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بڑوں، معاصرین اور چھوٹوں سے استفادہ نہ کرے [۱]، اسی لیے امام موصوف نے اپنے معاصرین و تلامذہ سے بھی روایت کی ہے [۲]۔

تلامذہ امام صاحبؒ کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا، فربری لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے براہ راست نوے ہزار آدمیوں نے ''جامع صحیح'' کو سنا تھا [۳]، امام صاحبؒ کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی اس میں شریک ہوتے تھے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے علماء ومحدثین تھے، مثلاً حافظ ابوعیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج وغیرہ جوحدیث کے ارکان

[۱] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۸۰ [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۷ [۳] ارشادالساری ص ۳۳

ستہ کے جلیل القدر رکن ہیں[۱]، ابوزرعہ، ابو حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، ابو عبداللہ الفربری وغیرہم بھی امام صاحب کے تلامذہ میں ہیں جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے محدث ہوئے، اور ہزاروں لاکھوں کو نفع پہونچایا[۲]۔

غیر معمولی قوتِ حافظہ امام موصوف نہایت قوی الحافظہ تھے، استاد سے جو حدیث بھی سنتے فوراً زبانی یاد ہو جاتی کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی میں ان کو ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں جس کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے تھے وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔

ابن مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں محمد بن سلام بیکندی کے پاس تھا، انہوں نے فرمایا کہ اگر تم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو میں تمہیں ایک ایسا بچہ دکھاتا جس کو ستر ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں[۳]۔

امام صاحب خود فرماتے تھے کہ ''مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، اور اس ''جامع صحیح'' کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے[۴]، امام صاحب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ جس وقت بغداد تشریف لائے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا، چنانچہ سو احادیث کے متن اور سندوں میں الٹ پھیر کر کے دس آدمیوں کے حوالہ کیا کہ ہر شخص ان میں سے دس دس حدیثیں اسی طرح امام صاحب کے سامنے پیش کرے، شہر کے بہت سے لوگ ان کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے، پھر ان محدثین نے حدیثیں پیش کیں، ہر مرتبہ امام موصوف ''لا أدري'' ہی فرماتے رہے، جب سب لوگ حدیثیں پیش کر چکے تو امام صاحب نے ہر متن کو اس کی

---

[۱] تہذیب الأسماء واللغات ج ۱ ص ۶۷/ از نووی [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۵۵
[۳] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۸۴ [۴] مقدمۂ ارشاد الساری ص ۲۹۰

اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سنا دیا، لوگ سن کر دنگ رہ گئے، اور آپ کے علم و فضل کا ان کو لوہا ماننا پڑا، **فأقر الناس له بالحفظ وأذعنوا له بالفضل۔**

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تعجب اس پر نہیں ہے کہ صحیح و غلط میں امتیاز کر دیا، کمال یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا، اس کو بھی بیان کر دیا[1]۔

انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین نے بھی امام بخاری کے کمال حفظ کے متعلق لکھا ہے:

''امام بخاری کا حافظہ و استحضار اس غضب کا تھا کہ معاصرین ائمہ تک کو وہ ایک کرامت نظر آتا تھا[2]۔

امام بخاری کا زہد و تقویٰ علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، انہوں نے اپنے والد سے ترکہ میں بہت سا مال پایا تھا، اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے رہتے تھے اور بسا اوقات آپ کو دو یا تین بادام پر دن گزارنا پڑا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''**كان قليل الأكل جداً مفرداً في الجود وقال: كان يقنع كل يوم بلوزتين أو ثلاث**''[3].

امام صاحبؒ نے کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالاں کہ بارہا اس کے مواقع آئے، ان کے شاگرد امام موصوف کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت میں آدم بن ابی ایاس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو خرچ کے آنے میں

---

[1] مقدمۂ فتح الباری ص ۵۷۵ و فتح المغیث ۱/ص ۱۱۶ [2] جلد چہارم ص ۵۷۷

[3] فیما یجب حفظہ للناظر ص ۲

بڑی تاخیر ہوئی یہاں تک کہ مجھ کو گھاس کھا کر دو دن گزارنے پڑے، تیسرے دن ایک صاحب نے آکر مجھے دینار کی تھیلی پیش کی جن کو میں پہچانتا بھی نہ تھا، اسی طرح ان کے ایک اور شاگرد کا امام صاحب کے واسطہ سے بیان ہے کہ جس وقت مجھے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی، اس وقت سے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی، اور اللہ تعالیٰ سے مجھے امید ہے کہ وہ اس بارے میں میرا محاسبہ نہیں فرمائے گا۔

امام موصوف ایک مرتبہ بیمار ہوئے، ان کا قارورہ اطباء کو دکھایا گیا، انہوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن استعمال نہیں کرتے، امام موصوف نے فرمایا کہ چالیس سال سے سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، نماز میں امام صاحب کے استغراق کا یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ایک بار ظہر کی نماز سے فراغت کے بعد نفل میں مشغول ہو گئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر اپنے بعض ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو قمیص کے اندر کچھ ہے تو نہیں، انہوں نے دیکھا تو بھِڑ نکلی، جس کے ڈنک سے ۱۷ نشانات تھے اور جسم کا وہ حصہ متورّم ہو گیا تھا، ایک صاحب نے عرض کیا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں توڑ دی، فرمایا میں ایک ایسی سورہ پڑھ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ اس کو ختم کرلوں [1]۔

شیوخ ومعاصرین کا اعتراف | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی مدح میں اگر متأخرین کے اقوال نقل کئے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے، **"فذالک بحر لا ساحل له"**۔

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

---

[1] مقدمہ قسطلانی ص۶۴ ولامع ص۴۲

ان کے شیوخ و معاصرین سب ان کے کمالات کے معترف تھے، ایک مرتبہ عمرو بن زرارہ اور محمد بن رافع امام بخاری سے علل حدیث کے متعلق مختلف سوالات کے جواب حاصل کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے، تو حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''أبو عبدالله أفقه منا و أعلم و أبصر'' امام اسحاق بن راہویہ نے فرمایا ''هو أبصر مني'' حالانکہ اس وقت امام صاحب سبزہ آغاز تھے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اسانید و علل میں امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں پایا، امام مسلم نے امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شہادت دی أشهد أنه ليس في الدنيا مثلك [۱]، ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس آسمان کے نیچے امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو عالم حدیث نہیں دیکھا [۲]۔

امام صاحب پر دور ابتلاء و آزمائش حدیث میں ہے کہ أشد الناس بلاء الأنبياء، ثم الأمثل فالأمثل چنانچہ امام موصوف کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے بڑے امتحان میں ڈالا، امام موصوف ۲۵۰ھ میں جب نیشاپور تشریف لائے تو محمد بن یحییٰ ذہلی نے لوگوں سے کہا کہ ان صالح عالم کی خدمت میں جا کر ان سے حدیثیں سنو، ان کے کہنے پر لوگ اس کثرت سے امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ خود محمد بن یحییٰ کی مجلس درس ماند پڑ گئی، پھر امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اس کی تصویر امام مسلم نے ان لفظوں میں کھینچی ہے کہ اہل نیشاپور نے اس سے پہلے کسی والی اور کسی عالم کا ایسا استقبال نہیں کیا تھا، ان کے استقبال کے لئے نیشاپور سے دو تین منزل باہر نکل آئے تھے، امام صاحب نیشاپور پہونچ کر درس

---

[۱] مقدمۂ فتح الباری ص ۵۵۷ [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸ والأسماء واللغات از نووی ج ۱ ص ۷۰

وتدریس میں مشغول ہوگئے امام ذہلی نے اعلان کردیا تھا کہ کسی اختلافی مسئلہ میں امام صاحب سے گفتگو نہ کی جائے، ورنہ اگر کوئی جواب ہمارے خلاف ہوا تو خراسان کے لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے، لیکن امام صاحب کے آنے کے دو ہی چار دن کے بعد جب آپ کے اشتیاق میں مکانوں اور چھتوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

ایک شخص نے قرآن کے الفاظ کے متعلق بار بار سوال کیا، اس لیے مجبوراً امام صاحب کو اس کا جواب دینا پڑا، آپ نے فرمایا:

القرآن كلام الله غير مخلوق	قرآن کلام الٰہی غیرمخلوق ہے، الفاظ
ألفاظنا من أفعالنا و أفعالنا	ہماری زبان کا فعل ہے اور ہمارے
مخلوقة و الامتحان عنه	تمام افعال مخلوق ہیں اور اس مسئلہ
بدعة[۱].	میں امتحان لینا بدعت ہے۔

عوام اس دقیق جواب کو نہ سمجھ سکے اور امام ذہلی نے شدت سے امام صاحب کی مخالفت شروع کردی، اور اپنی مجلس میں اعلان کرادیا کہ جو شخص لفظی بالقرآن غیر مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس درس میں نہ آئے، اس پر امام مسلم، احمد بن سلمہ جو حلقۂ درس کے ممتاز طالب علم تھے، امام ذہلی کی ساری تقریروں کو واپس کردیا اور ان کا حلقہ چھوڑ دیا۔

مسئلۂ خلق قرآن میں امام صاحب کا نقطۂ نظر | خلق قرآن کے بارے میں اوپر امام بخاری کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں امام احمد کے خلاف ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

[۱] مقدمۂ فتح الباری ص۴۹۲

واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ نے جب یہ مسئلہ اٹھایا کہ جس طرح خدا نے دنیا کو ''کن فیکون'' کے ذریعہ پیدا کیا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی پیدا کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مخلوق ہے لیکن یہ عقیدہ جمہور اہل سنت کے خلاف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور باری تعالیٰ کی صفت ہے کیوں کہ متلو اور تلاوت کے درمیان فرق ہے، متلو تو قدیم ہے اور تلاوت ہمارا فعل ہے اس لیے وہ حادث ہے، بعض لوگ اس تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن امام بخاری متلو اور تلاوت کے درمیان فرق کرتے تھے اور امام ذہلی کو اس پر اعتراض تھا[1]۔

امام احمد نے ان لوگوں پر جنہوں نے کلام اللہ کو مخلوق یا غیر مخلوق کہا یا اس بارہ میں توقف اختیار کیا ہے، اس لئے سخت تنقید کی ہے اور پوری قوت سے ان کا رد کیا، تاکہ آئندہ کے لیے اس مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند ہو جائے، بعد میں حنابلہ نے یہاں تک غلو کیا کہ کلام مجید کی روشنائی اور اوراق سب کو قدیم کہا، بعض نے قلم تک کو جس سے قرآن مجید لکھا گیا ہے قدیم کہہ دیا۔

امام بخاری کو اس غلو سے اختلاف تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا جیسا کہ بخاری جلد ثانی ''باب خلق أفعال العباد'' میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس بنا پر امام بخاری اور حنابلہ میں کشمکش پیدا ہو گئی اور امام صاحب کو قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں، کیوں کہ حکومت پر حنابلہ کا اثر تھا، غرض نیشا پور میں لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لیے اس قسم کے سوال و جواب پر امام صاحب کو مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں

---

[1] کتاب الأسماء والصفات ص ۳۳۷

ان کو نیشاپور چھوڑ کر اپنے وطن مالوف بخارا واپس آنا پڑا، لیکن وہاں بھی مخالفین نے سکون سے رہنے نہ دیا[۱]۔

وفات | چنانچہ امام صاحب کے بخارا واپس آنے کے بعد لوگوں نے والی بخارا کو آپ کے خلاف بھڑکانے کے لیے مختلف مقامات سے اس کے پاس خطوط لکھے، امام ذہلی نے بھی اس میں حصہ لیا، ان خطوط پر والی بخارا امام صاحب سے ناراض ہوگیا[۲]۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ والی بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے گھر جا کر اس کے بچوں کو ''الجامع الصحیح'' اور ''التاریخ الکبیر'' پڑھاویں، امام صاحب نے اس بنا پر اس سے انکار کیا کہ اس میں علم کی توہین تھی، تو والی بخارا نے کہا کہ لڑکے خود امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں گے، لیکن اس وقت وہاں کوئی دوسرا طالب علم نہ ہو، اس کو بھی امام صاحب نے منظور نہیں کیا، اس پر والی بخارا آپ سے برہم ہوگیا اور آپ کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا، جب سمرقند والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی لیکن وہاں کے لوگوں میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا، مجبوراً اپنے ننہال خرتنگ چلے گئے جو بخارا سے تھوڑے فاصلے پر تھا، پھر رمضان المبارک کا مہینہ گزار کر شوال میں سمرقند جا رہے تھے کہ راستہ میں دفعۃً پیام اجل آ گیا اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں حدیث رسول ﷺ کا یہ آفتاب تاباں غروب ہوگیا[۳]۔

امام بخاری کا مسلک | امام صاحب کے مسلک کے بارہ میں علماء میں اختلاف ہے کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے ان کو

---

[۱] مقدمۂ لامع الدراری ص ۱۳ [۲] مقدمۂ لامع ص ۱۲ [۳] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۹۴

اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہی معاملہ امام بخاری کے ساتھ بھی ہوا، تاج الدین السبکی نے ''طبقات الشافعیۃ'' میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ''ابجد العلوم'' میں شافعی ان کو لکھا ہے ۱؎، حافظ ابن حجر کے نزدیک امام بخاری کے مباحث فقہیہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے ۲؎۔

علامہ ابن قیم کی تحقیق میں امام موصوف حنبلی تھے ۳؎، لیکن علامہ طاہر جزائری کی نظر میں مجتہد مطلق ہیں ۴؎، مگر ان کی ''جامع صحیح'' کے مطالعہ سے جیسا کہ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں واضح ہوتا ہے کہ آپ بلا شک وشبہہ مجتہد مطلق تھے، اور یہ شہرت کہ آپ شافعی تھے، اور آپ نے مسائل مشہورہ میں امام شافعیؒ کے مسلک کی پیروی کی ہے، صحیح نہیں ہے، امام ابوحنیفہؒ کی موافقت بھی امام شافعی سے کم نہیں ہے ۵؎۔

حضرۃ الاستاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے شافعیہ کے مسائل پر جتنی جگہوں پر رد کیا ہے، اس کی تعداد حنفیہ کے رد سے کم نہیں ہے، البتہ حنفیہ کی زیادہ قوت سے تردید کی ہے، اور اس کے وجوہ ہیں ۶؎، اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر امام موصوف مجتہد مطلق ہیں تو ان کے خاص شاگرد امام ترمذی نے جہاں اپنی کتاب میں مذاہب کی طویل فہرست نقل فرمائی ہے، اس میں امام موصوف کا مسلک پوری کتاب میں ایک جگہ ''باب الاقتداء بالإمام'' میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان کا مذہب رائج نہیں ہوا تھا اور نہ ان کے مقلد ہوئے، اس

۱؎ ابجد العلوم ص ۸۱۰ ۲؎ فتح الباری ج ۱ ص ۱۲۳ ۳؎ إعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۲۶
۴؎ توجیہ النظر ص ۱۸۵ ۵؎ فیض الباری ج ۱ ص ۵۸ ۶؎ مقدمۂ لامع ص ۶۰

لیے ان کے مذہب کو بیان نہیں فرمایا[۱]۔

تصنیفات امام صاحبؒ نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ان کی مجمل فہرست یہ ہے:

(۱) الجامع الصحیح، (۲) الأدب المفرد، (۳) التاریخ الکبیر، (۴) التاریخ الأوسط، (۵) التاریخ الصغیر (۶) خلق أفعال العباد، (۷) جزء رفع الیدین، (۸) قرأۃ خلف الإمام، (۹) برالوالدین، (۱۰) کتاب الضعفاء، (۱۱) الجامع الکبیر، (۱۲) التفسیر الکبیر، (۱۳) کتاب الأشربۃ (۱۴) کتاب الھبۃ (۱۵) کتاب المبسوط (۱۶) کتاب الکنیٰ (۱۷) کتاب العلل (۱۸) کتاب الفوائد (۱۹) کتاب المناقب (۲۰) أسامی الصحابہ، (۲۱) کتاب الوحدان، (۲۲) قضایا الصحابۃؓ [۲]۔

الجامع الصحیح ان میں سب سے مہتم بالشان "الجامع الصحیح" ہے جس پر ہمیں آئندہ صفحات میں گفتگو کرنی ہے۔

متعین طور سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ امام موصوف نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز کس سنہ سے کیا اور کب اس سے فارغ ہوئے، لیکن اتنا معلوم ہے کہ تصنیف کرنے کے بعد اس کو اپنے شیوخ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، ابن المدینی ۲۳۴ھ اور ابن معین ۲۳۳ھ کے سامنے پیش کیا تھا۔

ابن معین کا سنہ وفات ۲۳۳ھ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سنہ میں بخاری تصنیف سے فارغ ہو چکے تھے، البتہ اس میں کچھ بعد میں اضافے بھی کرتے رہے [۳]، یہ کتاب امام موصوف نے سولہ سال میں مکمل کی، خود فرماتے ہیں "صنفت

---

[۱] إفادات حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ [۲] مقدمہ القسطلانی ص ۶۲ وتاریخ التراث العربی ۱/۲۰۴

[۳] اللامع ص ۳۷

کتابي الصحیح في ست عشرة سنۃ[۱]"اس لیےاس کاآغاز۲۱۷ھ میں ہوگا، جب کہ آپ کی عمر شریف۲۳سال کی تھی[۲]۔

وجہ تالیف امام بخاری کے عہد تک احادیث کے بہت سے مجموعے تیار ہوگئے تھے جب انہوں نے ان مجموعوں کو دیکھا اور پرکھا تو اس میں صحیح وضعیف ہر طرح کی روایات نظر آئیں، اس لیے انہوں نے احادیث صحیحہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ کیا جس میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہ ہو، ان کے استاد امیر المومنین فی الحدیث اسحاق بن راہویہ نے ان کے ارادہ کواور زیادہ قوی کردیا۔

امام بخاری فرماتے ہیں، ایک مرتبہ ہم ان کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے فرمایا کاش! احادیث صحیحہ کے عنوان پر ایک کتاب تم جمع کردیتے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، دوسری غیبی تائید یہ ہوئی کہ انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کے ذریعہ آپ کے اوپر سے دفع کررہے ہیں۔

بیدار ہوکر بعض معبرین سے تعبیر دریافت کی، انہوں نے کہا تم حضور ﷺ کی احادیث سے کذب کو دفع کروگے، اس خواب نے ان کے شوق ہمت کواور بلند کردیا، اور"الجامع الصحیح" کی تالیف میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مؤلف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے جواس کے نام سے ظاہر ہے[۳]۔

وجہ تسمیہ اس کتاب کا پورا نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ ﷺ و سننه و أيامه"[۴]۔

---

[۱] وفیات الأعیان ج۲ص۳۳۵ [۲] مقدمہ اللامع ص۳۶

[۳] مقدمہ فتح الباری ص۱۰ [۴] الأسماء واللغات ج۱ص۷۳

الجامع: جس میں فن حدیث کے آٹھوں ابواب ہوں، اس کو جامع کہتے ہیں، اور اس میں سب ابواب موجود ہیں۔ (سیر، آداب، تفسیر، عقائد، فتن، أشراط الساعۃ، أحکام، مناقب)۔

الصحیح: اس کی تمام حدیثیں صحیح ہوں، اگر کوئی معلل یا شاذ روایت آ گئی تو اس کا ضمناً ذکر ہے۔

المسند: بطور تاکید کے ہے۔

سننه: یعنی آپ کے اقوال وافعال واحوال پر مشتمل ہے۔

أیامه: امام بخاری نے دور جاہلیت کے بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے آپؐ کی زندگی کا تعلق ہے [۱]۔

اس تصنیف میں اہتمام اس تصنیف میں امام بخاری نے سولہ سال صرف کئے اور اس کو انہوں نے تین بار تصنیف کیا، فرماتے ہیں: "**قد صنفت کتبی ثلاث مرات**"، ملاعلی قاری فرماتے ہیں "**کأنه أراد بالتکریر التنقیح**" [۲]، یعنی تنقیح و تہذیب تین بار فرمائی، علامہ عینی فرماتے ہیں: ابن طاہر نے کہا کہ امام بخاری نے "صحیح بخاری" کو بخارا میں تصنیف کیا، ابن بجیر فرماتے ہیں کہ مکہ معظّمہ میں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بصرہ میں، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں تصنیف ہوئی [۳]۔

لیکن خود امام بخاری کا بیان ہے کہ میں نے "الجامع الصحیح" کو مسجد حرام میں تصنیف کیا، اور ہر حدیث کو درج کرنے سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ کر کے

---

[۱] إفادات حضرت الأستاذ شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ

[۲] مرقاۃ ج۱ ص۱۳ [۳] عمدۃ القاری ج۱ ص۵

دو رکعت نماز پڑھتا تھا، اور جب اس کی صحت پر پوری طرح انشراح ہوجاتا تھا، اس وقت حدیث کو کتاب میں جگہ دیتا تھا، اس اہتمام کی وجہ سے لوگوں کا قول ہے کہ امام بخاری نے گویا براہِ راست حضور ﷺ سے سنا ۔

كــأن البــخــاري في جــمـعــه   تلقّى من المصطفىٰ ما اكتسب ۱؎

بخاری کے تراجم نبی کریم ﷺ کے مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مسودہ سے مبیضہ میں منتقل کیا تھا اور ہر ترجمہ کے لیے دو رکعت نماز پڑھتے تھے ۲؎۔

مقام تصنیف کے بارہ میں جو متعدد مقامات بیان کیے جاتے ہیں ان میں حافظ ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ تصنیف کا ابتدائی خاکہ اور ترتیب و ابواب تو مسجد حرام میں لکھ لیے تھے اور مختلف مقامات پر احادیث کی تخریج فرماتے رہے، تراجم ابواب کے مسودہ کو مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مبیضہ میں تبدیل فرمایا ۳؎۔

الجامع الصحیح کی مقبولیت بخاری شریف کے محاسن وفضائل بے شمار ہیں جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، حافظ ابن صلاح بخاری ومسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كتـابـاهـمـا أصح الكتاب بعد	یعنی کتاب اللہ کے بعد ان دونوں
كتاب الله العزيز، ثم إن كتاب	کتابوں کا درجہ ہے، پھر ''صحیح بخاری''
البـخـاري أصـح الـكتـابيـن	کا مرتبہ صحت اور کثرت فوائد کے لحاظ
صحيحا وأكثرها فوائد ۴؎.	سے ممتاز ومقدم ہے۔

امام نسائی فرماتے ہیں: أجود هذه الكتب كتاب البخاري ۵؎۔

۱؎ مقدمۂ ارشاد الساری ص۲۰   ۲؎ مقدمۂ فتح الباری ص۴۹۱   ۳؎ مقدمۂ فتح الباری ص۴۹
۴؎ مقدمۂ ابن صلاح ص۱۱   ۵؎ تہذیب الأسماء واللغات ج۱ ص۷۴

ابوزید مروزی فرماتے ہیں کہ حجراسود اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا کہ خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا، اے ابوزید! امام شافعی کی کتاب کا درس کب تک دو گے؟ میری کتاب کا درس آخر کب دو گے؟ انہوں نے عرض کیا حضور، آپ کی کون سی کتاب ہے؟ فرمایا محمد بن اسماعیل البخاری کی ''الجامع الصحیح'' [۱]۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس کتاب کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مبتدع ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے [۲]۔

شاہ صاحب قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ''صحیح بخاری'' کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا [۳]۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: بخاری شریف کے پڑھنے سے قحط سالی دور ہو جاتی ہے اور قحط کے زمانے میں اس کے ختم کی برکت سے بارش کا نزول ہوتا ہے [۴]۔

ایک محدث نے اس کو ایک سو بیس مرتبہ مختلف مقاصد کے لیے پڑھا اور ہر مرتبہ کامیابی ہوئی [۵]۔ تفصیلی کلام کے لئے دیکھئے عربی ترجمہ ''أعلام المحدثین'' ص ۱۵۴۔

جامع صحیح کا مقصد و مقصود اعظم | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مصنف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے اور اس میں صرف احادیث صحیحہ ہی لائے ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کے ساتھ انہوں نے فقہی مسائل اور حکیمانہ نکتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ متون احادیث سے بہت سے معانی استنباط فرماتے ہیں، جو مناسب طریقے سے پوری کتاب میں موجود ہیں، اسی طرح آیاتِ احکام کی طرف بھی

---

[۱] مقدمۂ فتح الباری ص ۶۷۰ [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲۹۷ [۳] ایضاً ج ۱ ص ۳۵۰
[۴] مقدمۂ ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۹ [۵] مقدمۂ لامع الدراری ص ۸۴

پوری توجہ رکھی ہے، اوراس سے عجیب وغریب معانی کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: امام بخاری کی اصل غرض احادیث کے ذخیرہ میں سے صحیح ومستفیض ومتصل کا انتخاب ہے، اور فقہ وسیرت اور تفسیر کا بھی استنباط کیا ہے، اور اخذ حدیث میں جو شرط انہوں نے مقرر کی تھی، وہ بدرجۂ کمال پوری کی ہے ۱؎۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام موصوف کا مقصود اعظم اپنی ''الجامع الصحیح'' میں طرق استنباط ہے اسی لیے ''فقہ البخاري في تراجمه'' کہا گیا ہے، بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم ابواب میں ہے ۲؎۔

امام بخاری کے تخریج کے شرائط شروط الأئمہ پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، محمد ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ان ائمہ یعنی ''بخاری''، ''مسلم'' اور ''سنن اربعہ'' کے مصنفین میں سے کسی سے بھی تخریج روایات میں ان کے شرائط منقول نہیں، بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۳؎۔

بخاری کی شرط یہ ہے کہ وہ ایسی روایت کی تخریج کرتے ہیں جس کے سارے رواۃ صحابی مشہور تک ثقہ ہوں، اور ان کی ثقاہت پر کبار محدثین کا اتفاق ہو، اس کی سند متصل ہو منقطع نہ ہو، جس روایت کے صحابی سے دو یا اس سے زیادہ راوی ہوں، وہ نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہوگی، اور اگر ایک ہی راوی ہو اور اس کی سند صحیح ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، امام مسلم نے ایسے لوگوں سے بھی حدیث کی تخریج کی ہے جس کی حدیث کو کسی شبہہ کی بنا پر امام بخاری نے ترک کردیا تھا، جس کی مثال امام زہری کے تلامذہ میں جو اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کیے گیے

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۵۱ ۲؎ مقدمہ لامع ص ۸۷ ۳؎ مقدمہ لامع ص ۸۸

ہیں، امام بخاری نے ان میں سے طبقۂ اولیٰ سے اصالۃً اور طبقۂ ثانیہ سے جن کی احادیث پر ان کو اعتماد ہے، ان کو بخاری میں روایت کیا ہے لیکن بالاستیعاب ایسا نہیں کیا ہے، اور امام مسلم نے دونوں طبقوں کی حدیث بالاستیعاب لیا ہے، اسی طرح طبقۂ ثالثہ کی روایات کو امام بخاری نے بالکل قبول نہیں کیا ہے لیکن امام مسلم ان سے بھی کبھی کبھی روایت کرتے ہیں ۱؎۔

اسی طرح ابوعبداللہ حاکم نے حدیث صحیح کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کو کوئی مشہور صحابی نبی کریمؐ سے روایت کرے، پھر اس صحابی سے دو ثقہ راوی روایت کرتے ہوں لیکن ''صحیحین'' سے ان کا دعویٰ ٹوٹ جاتا ہے، کیوں کہ شیخین نے بہت سے ایسے صحابہ کی روایات کو نقل کیا ہے، جن سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہے ۲؎۔

کتب احادیث میں جامع بخاری کا مقام | مذکورہ بالا شرائط اور دیگر وجوہ کی بنا پر امت کا اتفاق ہے کہ ''صحیح بخاری'' کو صحاح اور تمام کتب حدیث پر ترجیح حاصل ہے، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ ''صحیح بخاری'' صحت اور دیگر فوائد کے لحاظ سے ''صحیح مسلم'' پر فائق ہے ۳؎۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

لا یوازیه فیه غیره لا "صحیح مسلم" ولا غیره ۴؎.	''بخاری'' کا ''صحیح مسلم'' یا اور کوئی کتاب مقابلہ نہیں کرسکتی۔

البتہ امام شافعیؒ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ:

۱؎ تدریب الراوی ص ۴۱ ۲؎ تدریب ص ۳۸
۳؎ مقدمۂ شرح مسلم ص ۱۱ ۴؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲۸

أنـه قال: "ما أعلم في الأرض كتابـا أكثـر صوابا من كتاب مـالک" وفـي لـفظ عنه: "ما بـعد كتاب الله أصح من موطأ مالک".	روئے زمین پرامام مالک کی کتاب سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی کتاب نہیں ہے اور ایک روایت میں ہے کہ کتاب اللہ کے بعد "مؤطا" امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔

لیکن علامہ نووی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا یہ فیصلہ ان دونوں کتابوں کے وجود میں آنے سے پیشتر تھا، امام شافعی کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی جب کہ امام بخاری کی عمر دس سال کی تھی، اور اسی سال امام مسلم پیدا ہوئے [۱]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں، "بخاری"، "مسلم" و"مؤطا" کی حدیثیں نہایت صحیح ہیں، اور "موطأ" کی اکثر روایات مرفوعہ "صحیح بخاری" میں موجود ہیں [۲]۔

لیکن حاکم کے شیخ ابوعلی نیشاپوری اور بعض مغاربہ نے "صحیح مسلم" کو **أصح الكتب بعد كتاب الله العزيز** کہا ہے، حافظ ابن حجر نے اس قول کی یہ توجیہ کی ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے حسن ترتیب کے لحاظ سے "مسلم" کو ترجیح دی ہو، کیوں کہ امام مسلم نے اپنے شہر میں بیٹھ کر نہایت سکون واطمینان کے ساتھ اپنی کتاب کی تصنیف کی، اور امام بخاری نے مختلف مقامات میں رہ کر روایات کی تخریج کی ہے، حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ (شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدنیؒ) فرماتے ہیں کہ اگر ان کے قول کی یہ توجیہ نہ کی جائے تو بھی جمہور کے مقابلہ میں ان کا قول شاذ ونا قابل اعتبار ہے [۳]۔

---

[۱] مقدمۂ لامع ص۴۱ [۲] عجالۂ نافعہ ص۶ [۳] إفادات

’’صحیح بخاری‘‘ کے ’’صحیح مسلم‘‘ پر ترجیح کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ ’’بخاری‘‘ کی روایات کے مقابلہ میں ’’مسلم‘‘ کی روایات پر زیادہ کلام کیا گیا ہے۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں:

لو لا البخاري لما جاء مسلم [۱]۔ اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کا وجود نہ ہوتا۔

تعداد روایات | علامہ نووی وشیخ ابن صلاح کے نزدیک تکرار کے ساتھ بخاری کی روایات کی تعداد ۷۲۷۵ ہے اور عدم تکرار کے ساتھ ۴۰۰۰ [۲]، لیکن حافظ ابن حجر نے پوری احتیاط سے شمار کیا تو روایات مرفوعہ کی تعداد ۷۳۹۷، اور تکرار کے ساتھ متابعات وتعلیقات کی تعداد ۱۳۴۱ ہے، جن میں اکثر کو امام بخاری نے مسنداً بیان کر دیا ہے، اور موقوفات صحابہ ومقطوعات تابعین کی تعداد ۳۴۱ ہے، اس طرح مجموعی تعداد ۹۰۸۲ ہے، غیر مکرر روایات مرفوعہ ۲۳۵۳، اور غیر مکرر متابع ومعلق ۱۶۰ ہیں، اس طرح غیر مکرر مجموعہ ۲۵۱۳ ہے، اس تعداد میں آثار صحابہ وتابعین جن کا تراجم ابواب میں تذکرہ ہے شامل نہیں ہیں [۳]۔

جامع صحیح کی خصوصیات | (۱) امام بخاری کو دوران تالیف میں جب کبھی تالیف کا سلسلہ چھوڑنا پڑا تو دوبارہ جب بھی شروع کیا تو اس کی ابتداء بسم اللہ سے کی، اس لیے درمیان میں متعدد جگہوں پر بسم اللہ مذکور ہے۔

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری نے اپنی ’’صحیح‘‘ میں صیغۂ تمریض سے روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ جن معلق

---

[۱] سیر أعلام النبلاء ۱۲/۵۷۰، والبدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۴۸ [۲] تدریب ص ۳۰ [۳] مقدمۂ فتح الباری ص ۲۶۵ ومقدمۂ لامع ص ۳۸/ استاذ محمد فؤاد عبد الباقی کی تحقیق میں غیر مکرر کی تعداد ۲۶۰۷ ہے

روایات کو امام موصوف نے صیغۂ جزم سے بیان کیا ہے، ان کی صحت کا فیصلہ کیا گیا ہے، لیکن جب صیغۂ تمریض سے بیان کرتے ہیں تو ان کی صحت کا حکم تو نہیں لگایا جائے گا، لیکن ''صحیح بخاری'' میں آ جانے کی وجہ سے نا قابل اعتبار بھی نہیں سمجھا جائے گا، حافظ ابن حجر نے علامہ نووی کے کلام پر تعقب کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں صحیح رائے ہمارے شیخ کی ہے کہ امام بخاری صیغۂ تمریض کو ضعف اسناد کے ساتھ خاص نہیں کرتے، بلکہ جب کبھی متن کو بالمعنی اختصار کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو صیغۂ تمریض سے اس اختلاف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

(۳) ''صحیح بخاری'' کا امراض ومصائب، دشمنوں کے خوف وغلبہ کی گرانی وغیرہ میں پڑھنا تریاق مجرب ہے۔

(۴) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری جب ''قال فلاں'' کہتے ہیں تو یہ مذاکرہ پر محمول ہوتا ہے، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس کا رتبہ تحدیث سے کم ہے، اور یہ صیغہ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں روایت ان کی شرط پر نہیں ہوتی، لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، کیوں کی کبھی اس کو صیغۂ تحدیث سے بھی بیان کر دیتے ہیں۔

(۵) امام بخاری کا معمول ہے کہ جب حدیث میں کوئی ایسا غریب لفظ آ جاتا ہے جس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہے تو اس کی وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کر دیتے ہیں اسی طرح کبھی باب کی مناسبت سے آیات قرآنی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور اکثر آیات کے بجائے صرف اس کے چند الفاظ نقل کر دیتے ہیں، ''کتاب التفسیر'' و ''کتاب بدأ الخلق'' میں بکثرت اس کی مثالیں ہیں۔

(۶) محدثین کرام کے نزدیک سند عالی کی بڑی خصوصیت رہی ہے، بخاری کا یہ

خاص امتیاز ہے کہ اس میں بائیس (۲۲) روایات ثلاثی ہیں، جن کا تذکرہ حاشیہ پرنہایت جلی قلم سے کیا گیا ہے، ان میں سے بیس (۲۰) ثلاثیات کے شیوخ حنفی ہیں اور دو کے متعلق تحقیق نہیں [۱]۔

(۷) شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر طرق استنباط ہے، اس لیے ایک ہی حدیث کو استنباط مسائل یا کسی دوسرے مقصد سے متعدد مقامات پر بیان کرتے ہیں مثلاً ''إنما الأعمال بالنیات'' والی روایت کو تیرہ مقام پر ذکر کیا ہے، حالانکہ امام موصوف نے خود فرمایا ہے کہ میں مکرر روایت کو اس کتاب میں داخل نہ کروں گا [۲]، حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ بالا رادہ اپنی کتاب میں ایک ہی سند و متن کو مکرر نہیں لاتے، اگر کہیں تکرار ہے تو محض اتفاقی ہے [۳]، پوری کتاب میں بائیس (۲۲) روایات مکرر ہیں جو اتنی ضخیم کتاب کے لیے زیادہ نہیں کہی جاسکتیں۔

(۸) تاریخ پر بھی امام بخاری کی مجتہدانہ نظر ہے، حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیق میں امام بخاری ہر کتاب کے شروع میں اس کے زمانۂ نزول اور مشروعیت کی ابتدا کی طرف بھی کبھی کبھی اشارہ کر دیتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں کوئی اختلاف ہو، اور کبھی صراحت بھی کر دیتے ہیں۔

(۹) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف ہر کتاب کے اختتام پر کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم کتاب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مثلاً ''بدء الوحی'' کے آخر میں ''**فکان ذلک آخر شأن هرقل**'' اور ''کتاب الحج'' کے ختم پر ''**واجعل موتي ببلد رسولک**''، حضرت الاستاذ کی رائے ہے کہ امام بخاری ہر

---

[۱] مقدمۂ لامع ص ۳۰ [۲] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۲۷ [۳] مقدمۂ فتح ص ۱۲

کتاب کے ختم پر کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم زندگی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کو موت کے استحضار کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

(۱۰) کتاب کی ابتدا اور انتہا میں گہرا ربط ہے، حافظ ابن حجر نے اپنے استاذ کا قول نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو ''کتاب التوحید'' پر ختم کیا، کیوں کہ توحید ہی آخرت میں کامیابی اور ناکامی کی اصلی میزان ہے اور اس کی ابتدا ''إنما الأعمال بالنیات'' کی حدیث سے فرمائی، کیوں کہ اعمال کی عند اللہ مقبولیت کے لیے اخلاص نیت ضروری ہے، اور آخرت میں صرف وہی اعمال وزنی ہوں گے جو اخلاص کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے کیے جائیں، یہ چند خصوصیات ''لامع'' کے مقدمہ سے بالاختصار نقل کی گئی ہیں۔

صحیح بخاری کے تراجم ابواب شروع میں کہا جاچکا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر جس طرح احادیث صحیحہ کی تخریج ہے اسی طرح وہ ان سے بہت سے مسائل کا استنباط واستخراج بھی فرماتے ہیں، اسی لیے کبھی کبھی ایک روایت متعدد جگہوں پر نقل کرتے ہیں، جیسے حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جو حضرت بریرہؓ کے واقعہ سے متعلق ہے، اس کو بیس (۲۰) مرتبہ سے زائد نقل کیا ہے، علماء کا مشہور مقولہ ہے کہ ''فقہ البخاري في تراجمه''، بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم میں ہے۔

علامہ کرمانی فرماتے ہیں، امام صاحب نے اپنے تراجم ابواب میں جس دقت نظر کا مظاہرہ فرمایا ہے، اس کو سمجھنے سے بڑے بڑے اہل علم قاصر رہے، اس کی اسی اہمیت کی بنا پر متقدمین اور متأخرین نے تراجم ابواب پر مستقل رسالے لکھے ہیں، اس ناچیز نے ''أعلام المحدثین'' میں ۹ر کتابوں کا ذکر کیا ہے، مگر آج ہمارے سامنے

صرف تین رسالے موجود ہیں۔

۱۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا رسالہ ''شرح تراجم البخاری''۔

۲۔ دوسرا حضرت شیخ الہند کا ''الأبواب و التراجم'' جو اردو میں ہے، پہلے رسالے میں چودہ اور دوسرے میں پندرہ اصول بیان کئے گئے ہیں، شراح بخاری میں حافظ ابن حجر اور عینی نے بھی تراجم ابواب کی طرف توجہ فرمائی ہے، اول الذکر نے بعض اصولوں کی نشان دہی بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ امام موصوف نے بہت سے فقہی فوائد اور حکیمانہ نکتے اپنی کتاب میں بکھیرے ہیں اور غور وفکر کرنے والوں کو اس میں بہت سی نادر چیزیں ملتی ہیں، من جد وجد [۱]۔

۳۔ ''الأبواب والتراجم'' یہ ہمارے استاذ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی کتاب ہے جو چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے، یہ ناچیز اس کو تحقیق وتعلیق کے بعد ۵؍جلدوں میں بیروت سے شائع کرا رہا ہے، واللہ الموفق، اس کتاب میں حضرت الاستاذ نے ان حضرات کے بیان کردہ اصولوں کی تفصیل فرمائی ہے اور اس پر اضافے بھی کیے ہیں، اس طرح ان اصولوں کی تعداد ستر تک پہونچ جاتی ہے، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو ہر جگہ حدیث وترجمہ میں مناسبت نظر آئے گی [۲]۔

امام دار قطنی وغیرہ کے شبہات | ''صحیح بخاری'' کی جن روایات پر دار قطنی وغیرہ نے نقد کیا ہے، ان کی تعداد مجموعی طور پر ایک سو دس ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی وغیرہ نے اس کا مفصل جواب دیا ہے، حافظ ابن حجر جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ الحمد للہ اکثر اعتراضات کا جواب کافی وشافی ہوگیا ہے، بعض جوابات محتمل ہیں البتہ چند

---

[۱] مقدمۂ فتح الباری ص۲ [۲] مقدمۂ لامع ص۹۰

جگہوں پر تکلف سے کام لینا پڑا ہے، جب کوئی منصف مزاج ان جوابات پر غور کرے گا تو مصنف کی جلالت شان اور کتاب کی عظمت اس کی نظر میں دو بالا ہو جائے گی، اور اس پر واضح ہو جائے گا کہ علماء میں جو اس کو حسن قبول حاصل ہوا، اور تمام کتب حدیث پر جو انہوں نے اس کو ترجیح دی ہے، وہ سراسر مبنی برحقیقت ہے، ناقدین کے اصول نقد چند کمزور اصولوں پر مبنی ہیں، جو جمہور ائمہ کے خلاف ہیں، اس لیے معارضہ کے وقت شیخین کی تصحیح کو فوقیت حاصل ہوگی [۱]، اسی طرح ''بخاری'' کے تقریباً اسی اور ''مسلم'' کے ایک سو ساٹھ رواۃ پر کسی نوع کا نقد کیا گیا ہے [۲]، حافظ ابن حجر نے اس کا اجمالی جواب یہ دیا ہے کہ:

ينبغي لكل منصف أن يعلم أن تخريج صاحب الصحيح لأي راوٍ كان مقتض بعدالته عنده وصحة حفظه وعدم غفلته.	یعنی ہر منصف مزاج کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ امام بخاری اپنی کتاب میں جس راوی سے تخریج کریں ان کے نزدیک اس راوی کے عادل اور صحیح الحافظہ ہونے کی دلیل ہے۔

اس لیے جمہور ائمہ نے ان دونوں کتابوں کو ''صحیحین'' کے نام سے یاد کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متابعات وشواہد میں بھی عدالت وحفظ کا وصف امام بخاری کے نزدیک ضروری ہے [۳]۔

تاہم اتنی ضخیم کتاب میں معمولی فروگزاشتوں اور تسامح کا ہونا نہ بعید ہے، اور نہ اس کی عظمت کے منافی ہے، چند مقامات پر امام موصوف سے تسامح ہو گیا ہے، جس

---

[۱] مقدمہ فتح ص۴۰۰ ومقدمۂ لامع ص۴۷
[۲] مقدمۂ لامع ص۸۴ وتدریب الراوی ص۴۲
[۳] مقدمۂ فتح ص۴۴۳ وارشاد الساری ص۲۱

سے واقفیت ایک طالب ''بخاری'' کے لیے ضروری ہے، تفصیل کے لیے ''لامع الدراری'' کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ''صحیحین'' پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ نے بہت سی ایسی روایات سے استدلال کیا ہے جو ''صحیحین'' میں موجود نہیں ہیں، پھر ''صحیحین'' کے اصح ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ''التقریر و التحبیر'' کے شارح ابن امیر الحاج نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ''صحیحین'' کی اصحیت مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے، وہ ائمہ مجتہدین جو ان کے پیشتر گزرے ہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں [۱]۔

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ شیخین اور اصحاب سنن وغیرہ فقہ اسلامی کی تدوین کے بعد پیدا ہوئے اور حدیث کی طرف اعتناء کیا، لیکن ائمۂ مجتہدین جو ان سے پیشتر گزرے ہیں، ان کے سامنے مرفوع وموقوف اور صحابہ وتابعین کے فتاوے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا اور مجتہد کی نظر حدیث کی صرف ایک قسم پر محدود نہیں ہوتی، آج ہمارے سامنے اس دور کی جوامع ومصنفات موجود ہیں، جن کے مصنفین ائمۂ مجتہدین کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں، اس لیے عُلُوِّ طبقہ کی وجہ سے ائمۂ مجتہدین کے لیے احادیث کی اسانید پر غور وخوض کرنا آسان تھا، پھر مجتہدین کا کسی حدیث سے استدلال اس کی صحت کی دلیل ہے، کتب ستہ کی ضرورت اوران سے استدلال مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے [۲]۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ سے روایت نہ کرنے کی وجہ کہا جاتا ہے کہ امام بخاری چونکہ حنفیہ سے ناراض تھے اس لیے انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نقل نہیں

---

[۱] التقریر و التحبیر ج۳ ص۳۰ [۲] مقدمۂ لامع ص۱۰۴

کی، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے شدت تعصب اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر بے جا تنقید کی وجہ سے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں نقل نہیں کی ۱؎، اسی طرح ''بعض الناس'' کے ذریعہ امام صاحب پر تعریض کی ہے، اوران پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے امام اعظمؒ کے ساتھ وہی روش اختیار کی جو امام جعفر صادق کے ساتھ کی تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق کو امام بخاری نے قابل استدلال نہیں سمجھا، حالانکہ وہ جمہور امت کے نزدیک ثقہ ہیں ۲؎۔

لیکن امام بخاری اور دیگر ائمۂ محدثین کے متعلق عناد وتعصب کا شبہہ کرنا نہایت نامناسب ہے، اکابر کی شان اس سے بلند تھی، علامہ کوثری نے اس بارہ میں نہایت مناسب ومعتدل رائے ظاہر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قابل غور امر یہ ہے کہ شیخین نے امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں نقل کی، حالانکہ ان کے صغیر السن تلامذہ سے ان کا لقاء وروایت دونوں ثابت ہیں، اسی طرح امام شافعیؒ کے بعض تلامذہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی، لیکن امام شافعی کی کوئی روایت اپنی کتاب میں درج نہیں کی، امام بخاری کو امام احمد سے زیادہ ملنے اوران کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اس کے باوجود ان سے صرف دو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، ایک تعلیقاً اور دوسری ایک واسطے سے، امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد ہیں، اور انہوں نے اپنی کتاب میں ان سے پورا استفادہ کیا ہے، لیکن امام بخاری سے ''صحیح مسلم'' میں کسی روایت کی تخریج نہیں کی،

۱؎ نصب الرایہ ج۱ص۳۵۵ ۲؎ ماتمس بالیہ الحاجۃ ص۲۸

امام احمدؒ، امام شافعیؒ کے تلمیذ رشید ہیں، اور ان سے ''موطأ'' امام مالکؒ کا سماع بھی کیا ہے لیکن امام مالکؒ کی کل پانچ روایات امام شافعیؒ کے واسطے سے اپنی کتاب میں درج کی ہیں، ان واقعات اوران محدثین کرام کے اخلاص و دیانت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہٴ مجتہدین کی احادیث کو روایت کرنے والے شرق و غرب ہر چہار سو پھیلے ہوئے تھے، ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، اس لیے ان محدثین کرام نے صرف ان راویوں کی روایات کی طرف توجہ مبذول فرمائی جس کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے ان محدثین کا دامن ہر تعصب وعناد سے پاک تھا[۱]۔

جامع صحیح کے شروح وحواشی ''جامع صحیح'' کی اہمیت ومقبولیت کی بنا پر ہر دور کے علماء نے اس پر شروح وحواشی لکھے ہیں، مقدمہ ''لامع'' میں ایک سو اکتیس سے زائد شروح وحواشی اور متعلقات ''بخاری'' کا تذکرہ ہے، اور شیخ عصام حسینی نے اپنی کتاب ''إتحاف القاري بمعرفة جهود أعمال العلماء على صحيح البخاري'' میں (۳۷۵) شروح وتعلیقات کی تعداد بتائی ہے، ان میں سب سے زیادہ ''فتح الباری'' کو شہرت حاصل ہوئی۔

(۱) **''فتح الباری''**: یہ شیخ الاسلام حافظ ابوالفضل احمد بن علی بن حجر (م۸۵۲ھ) کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۱۷ھ سے اس کا آغاز کیا، سب سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جب وہ مکمل ہوگیا تو شرح کی تالیف شروع کی، اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب شرح کا معتد بہ حصہ ہوجاتا تو اس کو طلبہ کی ایک جماعت نقل کرتی، پھر ہفتہ میں ایک دن اس پر مباحثہ و مقابلہ کیا جاتا، علامہ برہان بن خضر پڑھتے اور لوگ اپنے اعتراضات اور بحث پیش کرتے تھے، حافظ صاحب جواب دیتے، اس طرح یہ کام

---

[۱] حاشیہ شروط الأئمہ ص۵۰ وسیر أعلام النبلاء ج۱۰ ص۹۶

۸۴۲ھ میں ختم ہوا، مگراس کے بعد مصنف نے اس پر کچھ اضافے بھی کئے اوراس کی تکمیل وفات سے کچھ مدت پہلے ہوئی۔

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ''بخاری'' کی شرح کا دَین امت پر باقی ہے، حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ غالباً ''فتح الباری'' سے یہ دَین ادا ہو گیا۔

اس میں مصنف نے جامع صحیح کے ان نکات پر جوفن رجال یاتراجم ابواب کی تدقیقات فقہیہ سے متعلق ہیں، محققانہ بحث کی ہےاور حدیث کے مختلف طرق کوجمع کیا ہے جس سے حدیث کے کسی ایک احتمال یااعراب کی تعیین ہو جاتی ہے [۱]۔

(۲) ''**عمدۃ القاری**'': علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۲۱ھ سے اس کی ابتداء کی اور ۸۴۷ھ میں یہ شرح مکمل ہوئی، اتنی مدت اس لیے صرف ہوئی کہ درمیان میں مختلف موانع کی بناپر متعدد باراس کام کو بند کرنا پڑا، ورنہ زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت صرف ہوتی، علامہ عینی نے ''فتح الباری'' سے بہت استفادہ کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے بعض بعض ورق پورے کے پورے نقل کر دیئے ہیں۔

علامہ عینی نے اپنی شرح میں حافظ ابن حجر پر تعقبات بھی کئے ہیں، اور جن باتوں کو انھوں نے بالقصد ترک کر دیا تھا، ان کی تفصیل کر دی ہے مثلاً (۱) حدیث کے پورے متن کو نقل کر دیا ہے، (۲) رواۃ کے انساب کی وضاحت کی ہے، (۳) ہر راوی کا ترجمہ دیا ہے، (۴) لغات واعراب، معانی و بیان کی وضاحت کی ہےاور حدیث سے مسائل کا استنباط کیا ہے اشکالات وجوابات ''فتح الباری'' سے زیادہ ہیں [۲]۔

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ ''عمدۃ القاری''، ''فتح الباری'' سے ایک ثلث

---

[۱] مقدمہ ارشادالساری ص ۳۶   [۲] مقدمہ ارشادالساری ص ۳۶

مقدار میں زیادہ ہے اس میں مختلف مباحث کی ایسی وضاحت کی گئی ہے کہ قاری کو کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں رہتی، اگر ''فتح الباری'' کا مقدمہ نہ ہوتا تو ''عمدہ القاری'' کو اس پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی، عینی نے حافظ ابن حجر کے بہت سے اوہام پر تنبیہ کی ہے اور جب یہ کتاب ان کے سامنے آئی تو حافظ ابن حجر نے ان مقامات کی اصلاح کر لی اور علامہ عینی کی تردید میں ایک رسالہ ''انتقاض الاعتراض'' لکھنا چاہا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، اس لیے یہ رسالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکا، علامہ عینی، حافظ ابن حجر کے شیوخ کی صف کے آدمی ہیں، وہ عمر میں حافظ ابن حجر سے بارہ سال بڑے تھے، البتہ ان کا انتقال تین سال بعد ہوا۔

(۳) **''ارشاد الساری''**: شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی المصری صاحب ''المواہب اللدنیہ'' المتوفی ۹۲۲ھ، اس میں شرح و متن مخلوط ہے، لیکن متن کو سیاہی وسرخی سے ممتاز کر دیا ہے، نسخہ یونینیہ سے پورے کتاب میں استفادہ کیا ہے، اس لئے ضبط متون میں اس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

حقیقت میں یہ ''فتح الباری''، ''عمدۃ القاری'' کی تلخیص ہے، اگرچہ مصنف نے دوسری شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

(۴) **''الکواکب الدراری''**: علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی کرمانی (م ۷۸۶ھ) حافظ ابن حجر اور عینی نے اپنی شرحوں میں اس سے بہت کچھ لیا ہے، مصنف نے اس میں نحوی اعراب اور غریب الفاظ کو پوری طرح حل کیا ہے، یہ شرح مصر میں چھپ گئی ہے۔

(۵) **''شرح النووی''**: علامہ نووی المتوفی ۶۷۶ھ نے صرف کتاب الایمان تک

شرح لکھی تھی، اس کی تکمیل نہیں کر سکے، ''صحیح مسلم'' کے مقدمہ میں اس کا ذکر ہے، یہ طبع ہو چکی ہے۔

(۶) ''**تحفۃ الباری**'': شیخ الاسلام زکریا الأنصاری، تلمیذ حافظ ابن حجر المتوفی ۹۱۶ھ یہ مصر سے ۱۲؍جلدوں میں چھپ چکی ہے اور اس کا اختصار علامہ سندی کے حواشی کے ساتھ قاہرہ سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوا ہے۔

(۷) ''**تیسیر القاری**'': علامہ نورالحق بن مولانا عبدالحق الدہلوی المتوفی ۱۰۷۳ھ جس زمانے میں شیخ عبدالحق نے ''مشکوٰۃ شریف'' کی شرح لکھی تھی، اسی زمانہ میں ان کے صاحبزادے علامہ نورالحق نے ''صحیح بخاری'' کی شرح فارسی میں لکھنی شروع کی۔

(۸) ''**التوشیح علی الجامع الصحیح**'': حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی لطیف شرح ہے، اس کی تلخیص علامہ دمنتی نے کی ہے اور اس کا نام ''روح التوشیح'' رکھا ہے، طبع ہو چکی ہے۔

(۹) ''**شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح**'': شیخ جمال الدین الشافعی المتوفی ۶۷۲ھ کا رسالہ ہے، جو ہندوستان میں طبع ہو چکا ہے۔

(۱۰) علامہ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی السندی الحنفی کا حاشیہ جو مشہور و معروف ہے، یہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

(۱۱) شرح شیخ الإسلام ابن محبّ اللہ البخاری الدہلوی، یہ فارسی شرح ''تیسیر القاری'' کے حاشیہ پر چھپی ہے، مگر صرف چودہ پارے ہی طبع ہوئے ہیں۔

(۱۲) ''**عون الباری**'': نواب صدیق حسن خاں صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ نے ''تجرید البخاری'' کی مختصر شرح لکھی ہے، طبع ہو چکی ہے۔

(۱۳) ''**نبراس الساری فی أطراف البخاری**'': مولانا ابوسعید محمد بن عبدالعزیز الحنفی کی تصنیف ہے۔

(۱۴) ''**فیض الباری**'': علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے افادات ہیں جو ان کے تلمیذ رشید مولانا بدر عالمؒ (المتوفی ۵/رجب ۱۳۸۵ھ) میرٹھی نے درس کے وقت لکھے تھے۔

(۱۵) مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارن پوری المتوفی ۱۲۹۷ھ کا حاشیہ جس کے آخری حصے کی تکمیل حضرت نانوتوی نے کی نہایت مفید ہے۔

(۱۶) ''**لامع الدراری**'': حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ المتوفی ۱۳۲۳ھ کے درس کے افادات ہیں، جن کو ان کے مختلف تلامذہ نے جمع کیا تھا، سب سے آخری دورہ جس میں ملک کے بڑے بڑے علماء وفضلاء شریک تھے اور اس کے بعد سلسلۂ درس ختم ہو گیا تھا، اس دورہ میں حضرت کے مایۂ ناز شاگرد مولانا محمد یحیٰ صاحب شریک تھے بلکہ ان ہی کی خاطر حضرت نے اس دورہ کا افتتاح فرمایا تھا، اس آخری درس کے افادات کو حضرت کے تلامذہ نے قلم بند کیا تھا، اس پر حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحبؒ شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے تعلیق اور ایک مبسوط مقدمہ لکھا، اس کا مطالعہ حدیث کے طلباء واساتذہ کے لیے بہت مفید ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، اور عربی ٹائپ میں دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس مضمون کا بیشتر حصہ اسی سے ماخوذ ہے۔

اس ناچیز نے عربی میں ''**الإمام البخاري إمام الحفاظ و المحدثين**'' تالیف کی ہے جو دارالقلم دمشق سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے، اس میں

بہت کافی اضافے ہیں، اردو میں مستقل شائع کرنے کا خیال ہے۔ واللہ الموفق۔

نوٹ: مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کا حاشیہ مختلف جگہوں سے شایع ہوتا رہا ہے اور وہی مقبول ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ مختلف نسخے سے متن ''بخاری'' اور مختلف شروح سے حاشیۂ ''بخاری'' کا مقارنہ کیا جائے اور زیادتی وتعلیق کے ساتھ شایع کیا جائے، یہ خوشخبری دی جارہی ہے، الحمدللہ ہماری تحقیق وتعلیق کے ساتھ بیروت سے یہ (۱۵) جلدوں میں عنقریب طبع ہوکر منصۂ شہود پر آرہا ہے، اس کے مقدمہ میں مختلف نادرالوجود ''بخاری شریف'' کے نسخے کا تعارف بھی ہے۔

امام مسلمؒ

نام ونسب | نام مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاذ، لقب عساکرالدین، اور کنیت ابوالحسین ہے، مولد ومسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بناپر انہیں قشیری کہا جاتا ہے، علامہ ذہبی کی تحقیق میں امام مسلم ۲۰۴ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے [۱]، ان کے سن پیدائش میں قدرے اختلاف ہے، ۲۰۲ھ ۲۰۴ھ، ۲۰۶ھ مختلف اقوال ہیں اوراسی آخری قول کو ابن الاثیر نے ''جامع الأصول'' کے مقدمہ میں راجح قرار دیا ہے [۲]، اور ابن خلکان کی بھی یہی تحقیق ہے [۳]۔

سماع حدیث کے لئے سفر | امام مسلمؒ نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہر چہار جانب علم حدیث کا غلغلہ تھا، خوش قسمتی سے امام موصوف نیشاپور جیسے شہر میں پیدا ہوئے جسے اس زمانہ میں مرکزیت حاصل تھی، علامہ تاج الدین سبکیؒ فرماتے ہیں:

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۶۵

۲ فتح الملہم ص۱۰۰، وبستان المحدثین ص۱۱۶، و سیر أعلام النبلاء ج۱۲ ص۵۵۷

۳ وفیات الأعیان (۱۹۵/۵)

"قد كانت نيسا بور من أجلّ البلاد و أعظمها، لم يكن بعد بغداد مثلها" ۱؎ ۔	نیشا پور اس قدر بڑے اور عظیم الشان شہروں میں سے تھا کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہ تھی۔

علامہ ذہبیؒ نے امام موصوف کے سماع حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ کو قرار دیا ہے، اس لئے اس حساب سے گویا چودہ برس کی عمر سے سماعت کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، اس سے پہلے بھی سماعت کے مواقع حاصل تھے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے اس کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس فن کے نشیب و فراز اور اس کے نکات کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا۔

شیوخ و تلامذہ امام موصوف کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہو سکے، لیکن خراسان و نیشا پور میں اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے امام فن موجود تھے، امام موصوف نے ان کے علاوہ مختلف مقامات کی خاک چھانی، عراق، حجاز، شام و مصر ان مقامات پر بکثرت تشریف لے گئے، بغداد متعدد بار جانا ہوا۲؎، اور بغداد میں آپ نے درس بھی دیا ہے، بغداد کا آخری سفر ۲۵۹ھ میں ہوا، جس کے دو سال بعد آپ انتقال فرما گئے ۳؎، وہاں کے محدثین میں سے محمد بن مہران اور ابوغسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبلؒ اور عبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے استفادہ کیا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد اور

۱؎ طبقات الشافعیہ ج۱ ص۱۷۳ ۲؎ تاریخ ابن خلکان ج۲ ص۱۳۵

۳؎ ابن خلکان ج۲ ص۱۳۳

حرملہ بن یحییٰ کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی ۱؎ ،احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ وبلخ کا بھی سفر کیا، قال الذهبي: "رفيق مسلم في الرحلة إلى بلخ و إلى البصرة ۲؎ امام بخاریؒ سے نیشا پور میں بہت کچھ استفادہ کیا۳؎ ،ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، واسماعیل بن أبي اویس اورعون بن سلام وغیرہ سے بہت کچھ حاصل کیا امام بخاریؒ کے بہت سے شیوخ میں شریک ہیں ، تلامذہ میں ابوعیسیٰ ترمذی صاحب ''السنن''، ابوحاتم رازی، ابوبکر بن خزیمہ اورابوعوانہ جیسے ائمہ فن داخل ہیں۔

امام موصوف کے فضل کا اعتراف امام موصوفؒ کے زمانہ میں سیکڑوں ائمہ فن پیدا ہو چکے تھے، جن میں بہت سے شیوخ کو امام موصوف کی استاذی کا شرف حاصل ہے، تاہم امام صاحبؒ کی فطری قابلیت اورقوت حافظہ نے ان کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن نے ان مختصر الفاظ میں پیشین گوئی فرمائی:

''أي رجل يكون هذا'' ؟ خدا جانے کس بلا کا یہ شخص ہوگا۔

اسحاق کوسج نے امام صاحبؒ کو مخاطب کر کے فرمایا:

لن تعدم الخير ما أبقاك الله للمسلمين. جب تک اللہ آپ کو مسلمانوں کے لئے باقی رکھے گا بھلائی آپ کے ہاتھ سے نہ جائے گی۔

امام ابوزرعہ اورابوحاتم جیسے بزرگ امام صاحب کو اپنے زمانے کے تمام شیوخ پر ترجیح دیتے تھے، ابوقریش نے ان کو تمام دنیا کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے، ابوسلمہ جو امام صاحب کے رفیق درس تھے وہ آپ کے اس قدر گرویدہ تھے کہ پندرہ سال مسلسل

۱؎ مقدمۂ نووی ص۱۲ ۲؎ تذکرہ ج۲ ص۲۱۰ ۳؎ البدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۳۵

آپ کے ساتھ ''صحیح مسلم'' کی ترتیب میں شریک رہے [1]۔

اخلاق وعادات اورزہدوتقویٰ پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی اور نہ سب وشتم کیا[2]، امام صاحب اپنے اساتذہ وشیوخ کا بے حد احترام فرماتے تھے، نیشاپور کے سفر میں امام بخاریؒ کی خدمت میں بکثرت حاضر ہوتے تھے، ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی اور زہدوتقویٰ سے متأثر ہوکر بے ساختہ ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور بے خودی میں پکار اٹھے: ''**أقبّل رجليک يا أستاذ الأستاذين، وسيد المحدثين وطبيب الحديث في علله**''.

امام صاحبؒ نہایت پاکیزہ خواور انصاف پسند تھے، امام بخاریؒ کے نیشاپور کے زمانۂ قیام میں جب وہاں کی مجالس درس بے رونق ہوگئیں اور امام بخاری پر خلق کا ہجوم ہونے لگا تو حاسدین نے حسد کیا، عوام تو عوام امام ذہلیؒ تک نے امام بخاری کی مخالفت مسئلۂ خلق قرآن میں کی، اور اپنی مجلس درس میں اعلان کردیا: ''**ألا من كان يقول بقول البخاري في مسئلة اللفظ بالقرآن فليعتزل مجلسنا**''، اس اعلان کوسن کر امام مسلمؒ فوراً مجلس سے اٹھے اوران سے مسموعہ روایات کے تمام مسودے ان کوواپس کردیئے اور امام ذہلی سے بالکلیہ روایت کرنا ترک کردیا[3]۔

اسی طرح اپنی کتاب کولکھ کر ابوزرعہ کے سامنے پیش کیا، جن روایات کو وہ صحیح بتاتے ان کو باقی رکھتے اور جن پر وہ نکتہ چینی کرتے ان کوترک فرمادیتے[4]، اس سے امام صاحبؒ کے اخلاص وبے نفسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

---

[1] تذکرہ ج ۷ ص ۵۸۸ [2] بستان ص ۱۱۷

[3] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۴ [4] مقدمۂ نووی ص ۱۱ وتدریب ص ۸۷

امام صاحبؒ کا مسلک امام مسلم کے مسلک کی تعیین میں بڑی دشواری ہے، مولانا انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلم وابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے، چونکہ ''صحیح مسلم'' کے ابواب مؤلف نے بذات خود قائم نہیں کئے ہیں اس لئے ان کے مذہب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۱؂، ''عرف الشذی'' میں بھی ناقل نے یہی لکھا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ''**فلا أعلم مذهبه بالتحقيق**''، مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب نے انہیں شافعی شمار کیا ہے ۲؂۔

شیخ عبداللطیف سندیؒ فرماتے ہیں: امام ترمذی ومسلم کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں امام شافعیؒ کے مقلد ہیں، حالانکہ یہ دونوں مجتہد تھے، البتہ بہت سے مسائل میں ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے اجتہاد کی طرف حافظ ابن حجر نے بھی اشارہ فرمایا ہے، فرماتے ہیں: **ثقة إمام كذا في التقريب**، مولانا عبدالرشید صاحب کی تحقیق ہے کہ امام مسلم مالکی المذہب تھے ۳؂۔

مگر طبقات المالکیہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے، صاحب ''کشف الظنون'' فرماتے ہیں: ''**الجامع الصحيح**'' **للإمام مسلم الشافعيؒ**، صاحب ''**اليَانِعُ الجَنِيُ**'' نے امام مسلم کے سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ اصولی طور پر شافعی تھے انہوں نے امام شافعیؒ سے بہت کم اختلاف کیا ہے ۴؂۔

شیخ طاہر جزائری کی رائے بھی امام مسلم کے متعلق یہی ہے کہ وہ کسی امام کے مقلد محض نہیں تھے، البتہ امام شافعیؒ وغیرہ اہل حجاز کے مسلک کی طرف مائل تھے ۵؂۔

۱؂ فیض الباری ج۱ ص۱۸۳ ۲؂ حطہ ص۱۹۸ ۳؂ مختصراً ماتمس الیہ الحاجۃ ص۲۶
۴؂ مقدمۂ لامع ص۱۹ ۵؂ توجیہ النظر ص۱۸۵

وفات کا حال | امام صاحب کی پوری زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ نہایت حیرت انگیز اورعبرت خیز ہے،خصوصاًاس سے امام صاحبؒ کی علمی شیفتگی وانہاک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہا گیا ہے کہ مجلس درس میں ایک حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا جو امام صاحب کوسوء اتفاق سے یاد نہ آئی اور پھر گھر واپس آئے تو انھیں ایک خرمے کی تھیلی پیش کی گئی ،حدیث کی تلاش وجستجو میں اس قدر محو ہوئے کہ چھوہارے آہستہ آہستہ سب کھا گئے اور حدیث بھی مل گئی ، یہی امام صاحب کی موت کا سبب ہوا۔

شیخ ابن الصلاح فرماتے ہیں: "**وكانت وفاته بسبب غريب نشأ عن غمرة فكرية علمية**"، اس وقت عمر شریف ۵۵؍سال تھی۔

لیکن علامہ ذہبی فرماتے ہیں: تقریباً ساٹھ سال تھی ، کیونکہ مشہور قول کے مطابق آپ کا سن ولادت ۲۰۴ھ ہے [۱]۔

بہرحال امام صاحب نے ۲۵؍رجب ۲۶۱ھ یکشنبہ کے دن وفات پائی ، دوشنبہ کے روز جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر نصیرآباد میں دفن کئے گئے [۲]،علامہ ذہبی فرماتے ہیں "**قبره يزار**"، ان کی قبر مبارک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے [۳]۔

تصنیفات | "صحیح مسلم" کے علاوہ بھی امام صاحب نے بکثرت تصنیفات کی ہیں جن کی اجمالی فہرست پیش ہے: **مسند كبير ، كتاب الأسماء و الكنىٰ، جامع كبير، كتاب العلل، كتاب التمييز، كتاب الوحدان، كتاب الأقران ، كتاب سؤالات لأحمد بن حنبل، كتاب حديث عمرو بن شعيب ، كتاب الانتفاع بأهب السباع ، كتاب مشائخ مالك ، كتاب مشائخ الثوری ، كتاب**

---

[۱] سیر أعلام النبلاء ۵۶۴/۱۲، والمنتظم ۳۲/۵، ۳۳

[۲] ابن خلکان ۱۳۶/۲ [۳] تذکرہ ج۲ص۵۹۰

مشائخ شعبه ، كتاب من ليس له إلا راوواحد ، كتاب المخضرمين ، كتاب أولاد الصحابةؓ ، كتاب أوهام المحدثين ، كتاب الطبقات ، كتاب أفراد الشاميين و كتاب رواة الإعتبار[۱] .

الجامع الصحیح للامام مسلمؒ

مذکورہ بالا فہرست سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام موصوف نے بکثرت کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت ''الجامع الصحیح'' کو حاصل ہوئی ہے، اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہمیشہ ''صحیح بخاری'' کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ | اس پر ''الجامع'' کا اطلاق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے نہیں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''جامع'' وہ ہے جس میں حدیث کے ابواب ثمانیہ موجود ہوں، جیسے ''الجامع الصحيح'' للإمام البخاري، یا ''الجامع الصحيح'' للإمام الترمذی، لیکن ''صحیح مسلم'' میں فن تفسیر وقراءت سے متعلق احادیث بہت کم ہیں، اس لئے اس کو ''الجامع الصحیح'' نہیں کہا گیا ہے[۲]، اگر چہ فن تفسیر کی احادیث بہت کم ہیں لیکن آخر کتاب میں کچھ موجود ہیں، اس لئے اکثر محدثین نے اس کو ''الجامع'' کہا ہے۔

صاحب ''کشف الظنون'' اور صاحب ''قاموس'' نے بھی اس پر ''الجامع'' کا اطلاق کیا ہے، اس لئے متأخرین نے اس کو ''الجامع الصحیح'' کہا ہے، البتہ فقط متقدمین ''الصحیح'' کہتے تھے[۳]۔

تفسیر کے حصے کے مختصر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس باب کی روایتیں امام صاحب کی شرط پر بہت قلیل تھیں، اور خود امام بخاریؒ کی کتاب التفسیر تکرار وغیرہ کی وجہ

---

[۱] مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۰۰، وتدریب ص ۵۱۵ [۲] عجالۂ نافعہ ص ۶ [۳] مقدمہ لامع الدراری ص ۴۴

سے بہت طویل ہوگئی ہے ورنہ احادیث صحیحہ کی تعداد قلیل ہی ہے [۱]۔

غرض تصنیف احادیث کے ذخیرہ میں سب سے پہلے امام بخاریؒ نے احادیث صحیحہ مرفوعہ کو الگ منتخب فرمایا اور اپنی ''الجامع الصحیح'' کو تیار کیا، اس کو دیکھ کر امام مسلم کو بھی اسی عنوان سے ایک دوسرے انداز میں احادیث صحیحہ جمع کرنے کا شوق ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد ہیں اور ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اور اکثر شیوخ میں دونوں شریک ہیں [۲]۔

لیکن امام بخاری کے پیش نظر احادیث صحیحہ مرفوعہ کی تخریج اور فقہ وسیرت وتفسیر وغیرہ کا استنباط ہے اس لئے انھوں نے موقوف ومعلق، صحابہؓ وتابعینؒ کے فتاوے وغیرہ بھی نقل کئے ہیں، اس مقصد کے پیش نظر احادیث کے متون وطرق کے ٹکڑوں کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا ہے، اور امام مسلم کا مقصد اعظم فقط احادیث صحیحہ کو منتخب کرنا ہے، وہ استنباط وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے، بلکہ ہر حدیث کے مختلف طرق کو حسن ترتیب سے یکجا ہی بیان کرتے ہیں جس سے متون کے اختلاف اور مختلف اسانید سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے احادیث منقطع وغیرہ کی تعداد شاذ ونادر ہے [۳]۔

تعداد روایات امام صاحبؒ فرماتے ہیں:

صنفت هذا ''المسند الصحيح'' من ثلاث مأة ألف حديث مسموعة [۴].	میں نے تین لاکھ احادیث سے ایک ''مسند صحیح'' کا انتخاب کیا۔

---

[۱] افادات حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث وفتح ص ۱۶۵

[۲] مقدمۂ فتح الملہم ص ۹۴ [۳] حاشیہ شروط الائمہ ص ۵۵

[۴] مقدمۂ نووی ص ۱۳ و تذکرہ ص ۲۱۵

علامہ طاہر جزائری کے نزدیک مکررات کے حذف کے بعد ''صحیح مسلم'' کی تعداد روایات چار ہزار (۴۰۰۰) ہے، شیخ ابن الصلاح کی تحقیق میں مکررات کے علاوہ بنیادی حدیثیں چار ہزار ہیں[۱]۔

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اگر مکررات کا لحاظ کیا جائے تو ''صحیح مسلم'' کثرت طرق میں بخاری سے زائد ہے، چنانچہ احمد بن سلمہ جو امام موصوف کے ساتھ ترتیب میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ بارہ ہزار، اور ابو حفص میانجی فرماتے ہیں آٹھ ہزار، لیکن دوسرے قول میں حافظ ابن حجر نے نظر قائم کیا ہے، فی الواقع دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے شمار کا معیار دونوں کے نزدیک مختلف رہا ہو[۲]، غیر مکرر احادیث کی تعداد ۳۰۳۳ ہے۔

تراجم ابواب علامہ نوویؒ فرماتے کہ امام صاحب نے اپنی کتاب کو ابواب کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے، گویا فی الواقع کتاب کی تبویب کردی گئی تھی لیکن شاید حجم کتاب کی زیادتی یا اور کسی وجہ سے تراجم ابواب قائم نہیں فرمائے، ان کے بعد بہت سے محدثین نے تراجم ابواب قائم کئے ہیں، جن میں بعض مناسب اور بعض غیر مناسب ہیں، یا تو ترجمہ کی عبارت میں کمی یا الفاظ میں ناموزونیت ہوتی ہے، ان شاء اللہ میں اس کو اچھے انداز میں ان جگہوں پر پیش کرنے کی کوشش کروں گا[۳]۔

لیکن مولانا شبیر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مصنف کے شایان شان اب تک تراجم نہیں قائم کئے جا سکے، شاید اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو توفیق دے کر یہ کام لے لے[۴]۔

---

[۱] مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۹ [۲] تدریب ص ۳۰ [۳] مقدمۂ نووی ص ۱۵
[۴] مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۰۰

زمانۂ تصنیف | احمد بن سلمہ کا قول گزر چکا ہے، پندرہ سال میں ''صحیح مسلم'' کی ترتیب میں شریک رہا، جس سے مدت تصنیف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ابراہیم بن محمد بن سفیان جو امام صاحب کے خاص شاگرد ہیں، اور ''صحیح مسلم'' کے راوی ہیں، ان کے بیان کے مطابق ۲۵۷ھ میں اس کتاب کی قرأت سے فراغت پائی [۱]، اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے انتقال سے بہت پہلے کتاب مکمل ہو چکی تھی۔

امام صاحب کا اپنی تصنیف میں اہتمام | امام مسلم نے جمع حدیث میں نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا کیا، یعنی یہ نہیں کیا کہ جن حدیثوں کو صحیح سمجھا تھا نقل کر دیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اتفاق تھا، چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ:

ليس كل شئي عندي صحيح وضعته ههنا إنما وضعت ههنا ما أجمعوا عليه .	ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا ہے، میں نے تو یہاں صرف ان احادیث کو درج کیا ہے جن کی صحت پر شیوخ وقت کا اجماع ہے۔

(صحیح مسلم باب التشہد ح ۴۰۴)

شیخ ابن الصلاح وغیرہ نے اجماع سے اجماع عام سمجھا، اس لئے ان کو امام مسلم کے اس دعوے کی صحت کے متعلق سخت اشکال ہوا، لیکن امام مسلم کی مراد اجماع سے اجماع عام نہیں، بلکہ اس دور کے بعض خاص مشہور شیوخ وقت کا اجماع ہے، چنانچہ علامہ بلقینی نے اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل، یحیی بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید

---

[۱] مقدمۂ نووی ص ۱۴

ابن منصور خراسانی، ان چاروں ائمہ کے نام گنا کر لکھا کہ امام مسلم کی مراد اجماع سے ان چار حضرات کا اجماع ہے [۱]، جب کتاب مکمل ہوگئی تو ابو زرعہ امام الجرح والتعدیل کے سامنے پیش کیا، جس روایت میں کسی علت کی طرف اشارہ کیا اس کو کتاب سے خارج کر دیا، اس طرح پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ مجموعہ تیار ہوا جس کے بارے میں امام صاحبؒ نے خود فرمایا ہے:

''لو أن أهل الحديث يكتبون	محدثین اگر دو سو سال بھی حدیثیں
الحديث مأتي سنة فمدارهم	لکھتے رہیں جب بھی ان کا دار و مدار
على هذاالمسند'' يعني صحيحه [۲].	اسی ''المسند الصحیح'' پر رہے گا۔

صحیح مسلم کی خصوصیات | مجموعی طور پر ''صحیح بخاری'' کو صحت وغیرہ بہت سے امور میں پورے مجموعۂ احادیث پر فوقیت حاصل ہے، لیکن ''صحیح مسلم'' کو بھی بعض حیثیات سے ''صحیح بخاری'' اور پورے ذخیرۂ احادیث پر امتیاز ہے، چونکہ ہر مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی ایسی نئی وکار آمد بات ہو جو اسے دیگر کتابوں سے ممتاز کر دے، اس لئے چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو ''شرح نووی'' وغیرہ میں درج ہیں۔

(۱) امام صاحبؒ اگر دو یا اس سے زیادہ روایات کو بیان کرتے ہیں جن میں معنی کے اتحاد کے ساتھ الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے تو دونوں کو ایک اسناد میں جمع کر دیتے ہیں، لیکن جس راوی کے کچھ الفاظ بیان کرتے ہیں تو اس کی تعیین کر دیتے ہیں۔

---

[۱] تدریب ج۱ ص۹۸ [۲] مقدمہ نووی ص۱۳ وسیر أعلام النبلاء ج۱۲ ص۵۶۸

(۲) ''صحیح مسلم'' سے استفادہ بہت آسان ہے، کیونکہ ہر ایک حدیث کو اس کی مناسب جگہ پر بیان کرتے ہیں، وہیں پر اس کے طرق اور اس کی متعدد اسانید اور مختلف الفاظ کو جمع کر دیتے ہیں، جس سے اس حدیث کے تعدد طرق اور الفاظ سے بسہولت واقفیت ہو جاتی ہے۔

(۳) ''حدثنا'' و ''أخبرنا'' کے درمیان بھی فرق قائم رکھا ہے، اصل یہ کہ محدثین کرام کی تدریس کے دو طریقے رہے ہیں، ایک تو یہ کہ استاذ پڑھے اور تلامذہ سنیں، دوسرے استاذ شاگرد کے ہاتھ میں مجموعۂ حدیث دے دے اور شاگرد پڑھے استاذ سنے، حدیث کی صحت وقطعیت میں ان دونوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن بحث یہ ہے کہ پہلی قسم کی حدیثوں کو ''حدثنا'' اور دوسری قسم پر'' أخبرنا'' کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟ امام بخاریؒ وغیرہ کے نزدیک ''حدثنا'' کی جگہ پر ''أخبرنا'' یا اس کے عکس کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن محدثین کی ایک جماعت جس میں امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ اور امام نسائیؒ جیسے اکابر فن داخل ہیں، ان میں تفریق کرتے ہیں، دوسری قسم کی روایتوں کے لئے صرف لفظ ''أخبرنا'' رکھا ہے، امام مسلم بھی ان ہی لوگوں کے ہم خیال ہیں۔

(۴) روایتوں کے الفاظ کے اختلاف کو اچھی طرح ضبط کرتے ہیں، جیسے فرماتے ہیں ''**حدثنا فلان وفلان واللفظ لفلان قال**''، أو: ''**قالا حدثنا فلان**''، اسی طرح کبھی کسی حرف میں روایتوں کا اختلاف ہوتا ہے جس سے کبھی معنی میں تغیر واقع ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے معنی میں تغیر نہیں ہوتا، البتہ یہ تغیر بسا اوقات ایسا پوشیدہ ہوتا ہے کہ جس سے واقفیت کسی ماہر فن ہی کو ہوسکتی ہے لیکن امام صاحبؒ نے پوری کتاب میں اس کو بیان کرنے کا التزام فرمایا ہے۔

(۵) رواۃ کے سلسلے میں امام صاحب نے غایت احتیاط کوملحوظ رکھا ہے جیسے فرماتے ہیں **عبداللہ بن سلمة حدثنا سليمان يعني ابن بلال عن يحيىٰ وهو ابن سعيد**، چونکہ سلیمان اور یحییٰ کا نام امام صاحب نے اپنے شیخ سے بقید نسب نہیں سنا تھا اس لئے اس سلسلۂ روایت میں اس کو اچھی طرح واضح کر دیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے، اور یہ اضافہ اس مقصد کے تحت کیا ہے کہ ایک راوی کا دوسرے راوی کے ساتھ التباس نہ ہو سکے۔

(٦) امام صاحبؒ نے مختلف طرق اور تحویل اسانید کو ایجاز کے ساتھ نہایت عمدہ عبارت میں پیش فرمایا ہے۔

(۷) صحیفہ ہمام بن منبّہ وغیرہ کی احادیث کے مجموعہ کو جو ایک ہی استاذ سے مروی ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقت روایت ہر حدیث کے لئے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح، یحیی بن معین وغیرہ کے نزدیک تجدید اسناد کی ضرورت نہیں، لیکن استاذ ابو اسحاق اسفرائنی جو اصول حدیث کے بڑے امام مانے جاتے ہیں، وہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ہر حدیث کو بقید اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلمؒ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ صحیفہ ہمام بن منبّہ سے روایت کرنے میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

(۸) ''صحیح مسلم'' کو جن حیثیتوں سے ایک بےنظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے ان میں ایک وصف اس کتاب کا طرز ادا اور حسن ترتیب ہے جس سے امام موصوف کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم حدیث کی باریکیوں اور اسرار سے کس قدر واقف تھے، اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کی نظر ان تمام علوم پر ہو جس کی ایک محدث

کوضرورت پڑتی ہے۔

(۹) امام صاحب نے اپنی کتاب کو اپنے شہر میں نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ تصنیف کیا ہے اور اس وقت ان کے بہت سے مشائخ باحیات تھے، اس لئے الفاظ کے سیاق وسباق میں نہایت احتیاط وغور وفکر سے کام لیا ہے اور احادیث مرفوعہ ہی پر اکتفاء فرمایا ہے، ان کی کتاب میں موقوفات وغیرہ شاذ ونادر ہیں جو ضمناً پائی جاتی ہیں۔

(۱۰) حدیث کے پورے متن کو یکجا ہی بیان کرتے ہیں اور اس کے پورے الفاظ کو نقل کرتے ہیں اور روایت بالمعنی کے بجائے روایت باللفظ بیان فرماتے ہیں جو ان کی غایت احتیاط کی دلیل ہے اور اس کو صحابہؓ یا بعد کے لوگوں کے اقوال کے ساتھ ضم نہیں کرتے۔

صحاح ستہ میں صحیح مسلم کا مقام | علامہ نووی فرماتے ہیں ''کتاب اللہ العزیز کے بعد ''صحیحین، بخاری ومسلم'' کا مرتبہ ہے اور امت نے ان دونوں کتابوں کی تلقی بالقبول کی ہے، البتہ ''صحیح بخاری'' اور دیگر فوائد ومعارف کے لحاظ سے سب سے فائق وممتاز ہے'' ۱؎۔

علامہ جزائری لکھتے ہیں:

و رجحان كتاب البخاري على كتاب مسلم أمر ثابت ، أدّى إليه بحث جها بذة النقاد و اختبارهم ۲؎.

یعنی ''صحیح بخاری'' کا امام مسلم کی کتاب پر من حیث الصحۃ راجح ومقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے بحث وغور وفکر کے بعد کیا ہے۔

۱؎ مقدمۂ نووی ص۱۳ ۲؎ فتح الملہم ص۹۶

پس اسی سے معلوم ہوا کہ ''صحیح بخاری'' کے بعد دوسرے درجہ پر ''صحیح مسلم'' کو رکھا گیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''واقع است اجماع بر تلقی ایں ہر دو کتاب بالقبول والتسلیم زیرا کہ شیخین مقدم اند برائمہ عصر خود وعصر ما بعد در معرفت علل وغوامض ایں'' [1]۔

یعنی ''صحیح بخاری''، و''مسلم'' کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے، کیونکہ امام بخاری وامام مسلم اپنے زمانے اور مابعد کے ائمہ پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت وتمیز میں سب پر مقدم وفائق تھے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''حسن ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے اس کا مقام بہت بلند ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسے ''صحیح بخاری'' پر بھی اچھالا ہے'' [2]۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ حاکم کے شیخ ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں: ''ما تحت أديم السماء كتاب أصح من ''صحيح مسلم'' '' [3] اسی طرح بعض مغاربہ نے بھی ''صحیح مسلم'' کو ''بخاری'' پر ترجیح دی ہے، بظاہر ان لوگوں کی ترجیح کا منشا یہ ہے کہ امام صاحب کے پیش نظر فقط احادیث صحیحہ کا انتخاب ہے، برخلاف امام بخاری کے کہ وہ موقوفات وآثار وغیرہ کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دیتے ہیں، اگر یہی ہے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، چونکہ اس سے ''صحیح مسلم'' کا نفس صحت میں راجح ہونا لازم نہیں آتا، اور اگر مطلقاً اصح کہنا چاہتے ہیں تو یہ قول ناقابل اعتبار ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابوعلی وغیرہ کا قول مجمل ہے، اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بخاری کے سوا مسلم کی کتاب اصح ہے، اور اگر مطلقاً اصح کہنا

---

[1] اتحاف النبلاء ص۴۸ [2] فتح الملہم ص۹۹ [3] تذکرہ جلد۲ ص۱۶۵

چاہیں تو البتہ یہ قول نا قابلِ تسلیم ہے، مگر ان کے قول میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ بخاری سے اصح تو نہیں ہے البتہ اصحیت میں دونوں کتابوں کے درمیان مساوات ہے، اگر یہی مراد ہے تو یہ قول بھی جمہور امت کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہے، حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اپنے اس قول میں منفرد ہیں، علامہ ابوسعید علائی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوعلی ''صحیح بخاری'' سے ناواقف تھے [۱]، لیکن یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے بلکہ فی الواقع میرے نزدیک اصح کہنے سے مراد افضل ہے یعنی حسن ترتیب وغیرہ میں افضل قرار دیا ہے، بعض نے کہا کہ یہ دونوں کتابیں برابر ہیں، یہ تیسرا قول ہے [۲]۔

چونکہ ''صحیح مسلم'' کی روایات ورواۃ میں ''بخاری'' کے مقابلہ میں زیادہ کلام ہے، اس لئے حاصل کلام یہ ہے کہ اعلیٰ مرتبہ صحت میں ''بخاری'' اور پھر ''صحیح مسلم''، اس کے بعد ''ابوداود'' و''ترمذی'' و''نسائی'' کو حاصل ہے [۳]۔

عبدالرحمٰن شافعی فرماتے ہیں:

تنازع قوم في البخاري و مسلم — لديّ و قالوا: أيّ ذين تُقدم ؟

فقلتُ: لقد فاق البخاري صحةً — كما فاق في حسن الصناعة مسلم [۴]

تخریج روایت کے شرائط ''صحاح ستہ'' کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں تخریج کے شرائط نہیں بیان کئے البتہ ان کے مطالعہ کے بعد اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے [۵]، جس زمانے میں امام صاحب نے اپنی کتاب کو مرتب فرمایا، اس وقت موضوع وضعیف صحیح وغلط ہر طرح کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ

---

[۱] تدریب مختصراً ص۴۹ [۲] مقدمۂ لامع ص۱۳۶ [۳] مقدمۂ لامع ۱۳۷

[۴] بستان المحدثین ص ۱۰۶ [۵] شروط الائمہ ص۱۳۶، بحوالہ ارشاد الساری ص۳۷

میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں، جن سے ان کے شرائط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) وہ احادیث جو بالکل صحیح ہوں اور ان کے رواۃ متقن ضابط اور ثقہ تسلیم کئے گئے ہوں۔

(۲) وہ احادیث جن کے رواۃ باعتبار ثقاہت اور حفظ و اتقان کے پہلی قسم کے راویوں سے کم ہوں۔

(۳) وہ احادیث جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو، امام صاحب فرماتے ہیں کہ قسم اول کے بعد قسم ثانی کو کتاب میں درج کروں گا، لیکن قسم ثالث کی طرف التفات نہ ہوگا[1]۔

اس لئے اہل علم اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں کہ اس تقسیم سے کیا مراد ہے؟ حافظ ابوعبداللہ حاکم اور امام بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کی موت نے دوسرے طبقہ کی حدیثوں کی تخریج کا موقع نہیں دیا بلکہ ''صحیح مسلم'' میں صرف طبقۂ اولیٰ کی روایات ہیں، لیکن قاضی عیاض نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے، فرماتے ہیں کہ دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں البتہ فرق یہ ہے طبقۂ ثانیہ کی روایات متابعت یا شواہد کے طور پر درج ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی آ گئی ہیں جن میں طبقۂ اولیٰ کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طرح ان راویوں کی روایات سے بھی تعرض کیا ہے جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا وہ متہم بالبدعة ہیں، **كذلك فعل البخاري**[2]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: طبقۂ ثانیہ کی روایات کو تعلیقا امام بخاری لاتے

---

[1] مقدمۂ مسلم ص ۱۵ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۱ ص ۵۷۵ [2] شروط الأئمہ ص ۵۳ و فتح الملہم ص ۵۷

ہیں اور طبقۂ ثالثہ کی بھی بہت ہی قلیل روایات کو تعلیقا لائے ہیں، یہ تعلیقات تراجم ابواب میں ذکر کئے ہیں۔

غرض یہ کہ تینوں طبقات کی روایات کتاب میں آ گئی ہیں اور امام صاحب کے نزدیک حدیث صحیح کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو اور ابتدا تا انتہا ثقہ راویوں نے روایت کیا ہو، شذوذ وعلت سے پاک ہو، جب یہ شرائط کسی حدیث میں پائی جائیں تو وہ بالاتفاق صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب ان شرائط میں کوئی شرط موجود نہ ہو یا ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف ہو زیادہ تر ان روایتوں میں جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم مثلاً عکرمہ وعمر بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں، لیکن امام مسلم ان کو قابل روایت قرار نہیں دیتے [۱]،اس بنا پر امام مسلمؒ نے امام بخاریؒ کے ۴۳۴ راویوں سے اور امام بخاریؒ نے امام مسلمؒ کے ۶۲۰ راویوں سے روایت نہیں کیا ہے [۲]۔

اسی طرح امام مسلم نے ایسے لوگوں سے بھی حدیث کی تخریج کی ہے جن کی حدیث کو کسی شبہہ کی بنا پر امام بخاری نے ترک کر دیا تھا امام مسلم نے ان کی احادیث کو شبہہ کا ازالہ کر کے تخریج کی ہے [۳]، جس کی مثال امام زہری کے تلامذہ ہیں، جو اوصاف کی کمی وزیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، امام بخاری نے طبقۂ اولیٰ سے اصالۃً اور طبقۂ ثانیہ سے جن کی احادیث پر ان کو اعتماد ہے، ان سے بھی روایت کیا ہے لیکن بالاستیعاب ایسا نہیں کیا، اور امام مسلم نے دونوں طبقوں کی احادیث کو بالاستیعاب لیا ہے، اسی طرح طبقۂ ثالثہ کی روایات کو امام بخاری نے قبول

---

[۱] فتح الملہم ص ۵۶ [۲] مقدمۂ فتح الباری ص ۱۲ [۳] شروط الأئمہ ص ۸۶

نہیں کیا ہے لیکن امام مسلم ان سے بھی کبھی کبھی روایات بیان کرتے ہیں [۱]، ابن سید الناس فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد اور مسلم کی شرطیں تقریباً یکساں ہیں مگر جمہور محدثین نے ان کے قول کی تردید کی ہے [۲]۔

صحیح مسلم کا سلسلۂ روایت ''صحیح مسلم'' کی شہرت اگرچہ مصنف سے تواتر کی حد تک پہونچی ہوئی ہے لیکن اس کی روایات کا سلسلہ شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان نیشاپوری المتوفی ۳۰۸ھ سے قائم رہا، ابراہیم بن سفیان کو امام مسلم سے خاص ربط تھا، اکثر حاضر خدمت رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس کتاب کی قراءت سے جوانہوں نے ہمارے لئے شروع کی تھی، رمضان ۲۵۷ھ میں فراغت پائی، یوں بلاد مغرب میں امام صاحبؒ کے ایک اور شاگرد ابو محمد احمد بن علی قلانسی سے بھی ''صحیح مسلم'' کی روایت کی جاتی ہے، لیکن اس کا سلسلہ مغرب کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا، جو قبول عام ابراہیم نیشاپوری کی روایت کو نصیب ہوا وہ قلانسی کی روایت کو نہ ہو سکا، علاوہ ازیں ''صحیح مسلم'' کا آخری حصہ جو تین جزو کے قریب قریب ہے ابو محمد قلانسی نے امام مسلم سے براہ راست نہیں سنا، بلکہ وہ اس کو ابراہیم کے شاگرد ابو محمد جلودی سے روایت کرتے ہیں [۳]۔

صحیح مسلم پر بعض شبہات علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ''صحیحین'' پر استدراک کیا گیا کہ بہت سی احادیث کی تخریج میں شیخین کے شرائط پورے پورے موجود نہیں ہیں، امام دارقطنی نے اس پر مستقل رسالہ ''الاستدراک والتتبع'' [۴] کے نام سے لکھا، اور تقریباً دوسو احادیث پر کسی نوع کا کلام کیا ہے، نیز بعض دیگر علماء نے بھی استدراک کیا ہے [۵]۔

---

[۱] تدریب ص۴ [۲] تدریب ص۵۶ [۳] مقدمۂ شرح مسلم از نووی ص۲۶

[۴] دارقطنی کی یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ [۵] مقدمۂ شرح نووی ۴۹

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہر منصف کے سامنے جو ان احادیث پر غور کرے گا یہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ ان اعتراضات کا تعلق موضوع کتاب سے نہیں، پھر وہ احادیث دوسرے اسانید سے بھی مروی ہیں، شیخ ابن صلاح وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کتاب کی صحت کو امت نے تسلیم کیا ہے، لیکن جن جگہوں پر اعتراضات کئے گئے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں [۱]۔

حافظ ابن حجر نے کہا کہ ان روایات کی تعداد ۲۲۰ ہے جس میں ۳۲ میں ''صحیحین'' کا اشتراک ہے اور ۷۸ ''بخاری'' میں اور ۱۰۰ ''مسلم'' میں، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ ''صحیحین'' کی جن احادیث کی تضعیف کی گئی ہے ان کی بنا ایسی علل پر ہے جو کچھ حارج نہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وھو احترازٌ حسنٌ [۲].

علامہ ابن تیمیہ ''صحیحین'' کے سلسلہ میں فرماتے ہیں جو شخص سات ہزار دراہم کو پرکھے گا اگر چند دراہم اس کے معیار کامل پر نہ اتریں تو اس میں کوئی نقص کی بات نہیں [۳]۔

امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو امام ابوزرعہ رازی کے سامنے پیش کیا، جس حدیث میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا، میں نے ترک کر دیا، اس سے یہ بات معلوم ومتعین ہوگئی کہ شیخین ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں جن میں کوئی علت نہ ہو یا ایسی علت ہے جو ان دونوں کے نزدیک غیر مؤثر ہے پس معترضین کا نقض شیخین کی تصحیح کے معارض ہوگا، اور شیخین کی تصحیح کو دوسروں کے مقابل میں جو فوقیت

---

[۱] فتح الملہم ص۹۶ — [۲] مقدمۂ فتح الباری ص۳۴۶

[۳] فتح الملہم ص۹۶ — [۴] تدریب ۱/۱۳۶

سے وہ معلوم ہے،اس کے بعد حافظ نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے[1]۔

صحیح مسلم کی شروح ''صحیح مسلم'' پر بہت سی شروح وحواشی اور مستخرجات لکھے گئے ہیں، صاحب ''کشف الظنون'' نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے، ہم یہاں چند مشہور شروح کا تعارف کرارہے ہیں:

(۱) ''المنهاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج'': یہ حافظ ابوزکریا یحیٰی بن شرف النووی المتوفی ۶۷۶ھ کی تصنیف ہے جو طبع ہوکر مشہور ومعروف ہوچکی ہے۔

(۲) ''مختصر شرح النووی'': شیخ شمس الدین محمد بن یوسف القونوی الحنفی المتوفی ۲۸۸ھ نے اسی منہاج کا اختصار کیا ہے۔

(۳) ''إکمال المعلم بفوائد مسلم'': علامہ قاضی عیاض المالکی المتوفی ۵۴۴ھ قاضی صاحب نے علامہ مأزری کی شرح کی تکمیل کی ہے اور طبع ہوچکی ہے۔

(۴) ''المعلم بفوائد کتاب مسلم'': ابوعبداللہ محمد بن علی المأزری المتوفی ۵۳۶ھ اس کی تکمیل قاضی صاحب نے کی ہے، اسی لئے قاضی صاحب نے اپنی شرح کا نام ''إکمال المعلم''، رکھا ہے، یہ شرح تین جلدوں میں شیخ شاذلی نیفر کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔

(۵) ''المفهم لما أشتمل فی تلخیص کتاب مسلم'': ابوالعباس احمد بن عمر بن أبی ابراہیم القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ، علامہ موصوف نے سب سے پہلے ''صحیح مسلم'' کی تلخیص و تبویب کی، اس کے بعد اس کی شرح لکھی، مصنف کا بیان ہے کہ ان کی شرح میں علاوہ توجیہ واستدلال کے اعراب کے نکات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

(۶) ''إکمال المعلم'': امام ابوعبداللہ محمد بن خلیفہ الوشتانی الأبّی المالکی المتوفی

۷۷۸ھ مصنف نے قاضی عیاض، علامہ نووی، قرطبی اور مازری کی شروح سے مدد لی ہے اور بہت سے فوائد کا اضافہ کیا ہے، یہ کتاب بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) ''المفہم فی شرح غریب مسلم'': امام عبدالغافر بن اسماعیل الفارسی المتوفی ۵۲۹ھ الفاظ غریبہ کی شرح ہے۔

(۸) ''شرح صحیح مسلم'': عماد الدین عبدالرحمٰن بن عبدالعلی المصری، اس شرح کی کیفیت معلوم نہیں۔

(۹) ''شرح صحیح مسلم'': علامہ ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود الزاوی المتوفی ۷۴۴ھ یہ ''معلم''، ''اکمال''، ''مفہم'' اور ''منہاج'' کا مجموعہ ہے۔

(۱۰) ''الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج'': علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ، یہ نہایت لطیف شرح ہے، ۱۹۹۸ء میں مکتبہ رشد ریاض سے یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

(۱۱) ''وشی الدیباج'': علامہ بجمعوی المتوفی ۱۲۹۸ھ نے علامہ سیوطی کی شرح کی تلخیص کی ہے، جو مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

(۱۲) ''السراج الوہاج'': مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ، یہ بھی مختصر منذری کی شرح ہے، جو طبع ہو چکی ہے۔

(۱۳) ''مختصر صحیح مسلم'': علامہ عبدالعظیم منذری نے ''صحیح مسلم'' کا اختصار کیا اور تبویب بھی کی ہے، اس کی شرح شیخ عثمان بن عبدالملک متوفی ۷۳۸ھ نے کی ہے۔

(۱۴) ''فتح الملہم'': یہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ المتوفی ۱۹۴۹ء کی شرح ہے، اس کی صرف تین جلدیں مکمل ہو سکیں، غالباً چھ جلدوں میں یہ مکمل ہوتی، مگر افسوس کہ حضرت مولانا کا وصال ہو گیا، اس لئے کتاب ناقص رہی، اس سے مسرت ہوئی

کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اس شرح کو مکمل کر دیا جو پاکستان سے شائع ہو چکی ہے[۱]۔

مصنف نے شروع میں ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جس میں علم حدیث کے اصول وضوابط اور کتاب کی خصوصیات سے بحث کی ہے، نیز شرح میں خصوصیت سے اسرارِ حدیث کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، اس مقالہ میں اس سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے۔

(۱۵) **"الحل المفهم لصحیح مسلم"** یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے درس کے امالی ہیں جن کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند کیا ہے، محترم مولانا محمد عاقل صاحب کے حواشی کے ساتھ جو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی زیرنگرانی لکھے گئے ہیں دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔

"صحیح مسلم" کی شروح ومتعلقات کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے جو ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ، علامہ قسطلانی المتوفی ۹۲۳ھ وغیرہ کے قلم سے نکلی ہیں، صاحب "کشف الظنون" وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے[۲]۔

---

[۱] یہ شرح بیروت سے ۱۲/ جلدوں میں بھی شائع ہوئی ہے۔

[۲] اس ناچیز نے عربی میں امام مسلم اور ان کی کتاب پر مقالہ لکھا تھا جس میں اضافہ ہے یہ اضافہ "أعلام المحدثین" میں نقل کر دیا گیا ہے۔

امام ابوداودؒ

نام ونسب سلیمان نام، کنیت ابوداود تھی، والد کا نام اشعث بن اسحاق تھا، سیستان کے رہنے والے تھے، جو ہرات اور سندھ کے درمیان بلوچستان کے قریب واقع ہے، سیستان کا معرب سجستان ہے، اس لئے وطن کی طرف منسوب ہو کر سجستانی کہلاتے ہیں، اگرچہ ان کے وطن کی تعیین میں قدرے اختلاف ہے۔

ابن خلکان نے کہا ہے کہ سجستان بصرہ کے اطراف میں ایک دیہات کا نام ہے لیکن شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ ہرات و سندھ کے درمیان ایک مشہور شہر ہے [1]۔

لیکن وہاں کے جغرافیہ میں اس نام کے شہر کا کہیں پتہ نہیں چلتا، یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ یہ خراسان کے اطراف میں ہے اور اس کو سجز بھی کہتے ہیں اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے [2]، اس لئے امام ابوداؤد سجزی بھی کہلاتے ہیں۔

پیدائش و وفات امام موصوف سیستان میں ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے، لیکن انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ بغداد میں گزارا اور وہیں اپنی ''سنن'' کی تالیف کی، اسی لئے ان سے روایت کرنے والوں کی اس اطراف میں کثرت ہے، لیکن بعض وجوہ سے ۲۷۱ھ

---

[1] وفیات الأعیان ۲/۴۰۴ وتذکرۃ الحفاظ ۲/۵۹۳ [2] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷

میں بغداد کو خیر باد کہا اور زندگی کے آخری چار سال بصرہ میں گزارے جو اس وقت علم و فن کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور وہیں بروز جمعہ ۲۷۵ھ کو وفات پائی [۱]۔

تحصیل علم کے لئے سفر ان کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں لیکن جس زمانے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اس وقت علم حدیث کا حلقہ بہت وسیع ہو چکا تھا، اس لئے امام موصوف نے مختلف بلاد کا سفر کیا اور اس زمانہ کے تمام مشاہیر اساتذہ وشیوخ سے علم حاصل کیا، صاحب ''اِکمال'' نے لکھا ہے:

قدم بغداد غير مرة بغداد متعدد بار تشریف لائے۔

نیز تحصیل علم کے لئے عراق، خراسان، شام، جزیرہ (یہ دجلہ وفرات کے درمیان کا علاقہ ہے) وغیرہ مختلف شہروں کا سفر کیا اور ہر جگہ کے ارباب فضل وکمال سے استفادہ کیا [۲]۔

اساتذہ وشیوخ امام ابوداؤد تحصیل علم کے لئے جن اکابر وشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا استقصا دشوار ہے، خطیب تبریزی فرماتے ہیں کہ: **أخذ العلم ممن لا يُحصىٰ** [۳]۔

انہوں نے بے شمار لوگوں سے حدیثیں حاصل کیں، ان کی ''سنن'' اور دیگر کتابوں کو دیکھ کر حافظ ابن حجر کے اندازہ کے مطابق ان کے شیوخ کی تعداد تین سو سے زائد ہے، وہ امام بخاریؒ کے بہت سے شیوخ میں ان کے شریک ہیں، ان کے اساتذہ میں امام احمد، قعنبی، ابوالولید طیالسی، مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین جیسے ائمۂ فن ہیں [۴]۔

---

[۱] وفیات الأعیان ج ۲ ص ۴۰۵ — [۲] اتحاف النبلاء ص ۲۵۷ وتاریخ بغداد ۹/۵۵

[۳] مفتاح السعادۃ ۲/۹ — [۴] تذکرہ ج ۲ ص ۱۵۳

تلامذہ ان کے تلامذہ کا شمار بھی مشکل ہے، ان کے حلقۂ درس میں کبھی کبھی ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا، علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے لئے سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ ان کے تلامذہ میں سے ہیں، اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی حدیث عتیرہ کو ان سے سنا ہے اور امام ابوداؤد اس پر فخر کیا کرتے تھے[۱]۔

زہد وتقویٰ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ امام موصوف فقہ وعلم اور حفظِ حدیث، زہد و عبادت، یقین وتوکل میں یکتائے روزگار تھے[۲]، ان کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کے کُرتہ کی ایک آستین تنگ تھی اور ایک کشادہ، جب اس کا راز دریافت کیا گیا تو بتایا کہ ایک آستین میں اپنے نوشتہ رکھ لیتا ہوں اس لئے اس کو کشادہ بنا لیا ہے اور دوسری کو کشادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، نہ اس میں کوئی فائدہ تھا، اس لئے ان کو تنگ ہی رکھا ہے، ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ورع وتقویٰ، عفت وعبادت کے بہت اونچے مقام پر فائز تھے[۳]، کہا گیا ہے کہ امام موصوف رفتار وگفتار میں اپنے استاذ امام احمدؒ کے بہت مشابہ تھے[۴]۔

امام صاحبؒ کے فضل کا اعتراف امام موصوف کو علم وعمل میں جو امتیازی مقام حاصل تھا، اس زمانے کے علماء ومشائخ کو بھی اس کا پورا پورا اعتراف تھا، چنانچہ حافظ موسیٰ بن ہارون فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لئے اور آخرت میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، میں نے ان سے افضل کسی کو نہیں دیکھا، امام ابراہیم حربی کا یہ فقرہ ابوداؤد کے متعلق مشہور ہے کہ حدیث کو ان کے لئے اس طرح نرم کر دیا

---

[۱] طبقات الحفاظ ص ۲۶۱ [۲] اتحاف النبلاء ص ۲۵۷

[۳] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۲ [۴] مقدمۂ بذل المجہود وتذکرہ ج ۲ ص ۱۵۳

گیا تھا جیسے حضرت داود علیہ السلام کے لئے لوہا، حاکم کی رائے یہ ہے کہ ’’ **إمام أهل الحديث في عصره بلا مدافعة**‘‘ امام ابوداؤد بلاشک وریب اپنے زمانے میں محدثین کے امام تھے [۱]۔

ابوداؤد کا مسلک | اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا مسلک کیا ہے، اور کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ ہوتا رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے ان کو اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی، یہی معاملہ امام ابوداؤد کے ساتھ بھی ہوا، ’’بستان المحدثین‘‘ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے مسلک میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ شافعی تھے، بعض حضرات نے ان کو حنبلی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے ان کو شافعی شمار کیا ہے، لیکن مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے ان کو حنبلی فرمایا ہے [۲]، مگر ان کی ’’سنن‘‘ کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ امام ابوداؤد حنبلی المسلک ہی تھے، ان کی ’’سنن‘‘ کے تراجم پر غور کرنے کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی، امام موصوفؒ نے اپنی ’’سنن‘‘ میں بہت سے مقامات پر دوسری ثابت ومعروف روایات کے مقابلہ میں ان احادیث کو ترجیح دی ہے جن سے امام احمدؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، مثلاً ترجمہ قائم کرتے ہیں ’’**باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة**‘‘ [۳]۔

چونکہ امام احمدؒ کے نزدیک قضائے حاجت کے وقت استدبار قبلہ مطلقاً جائز ہے اس لئے ترجمۃ الباب میں اس کو ترک کر دیا، مزید برآں اس کے آگے ’’**باب الرخصة في ذلك**‘‘ [۴] کا ترجمہ قائم کر کے استدبار قبلہ کا جواز ثابت کیا ہے، اسی

---

[۱] مقدمۂ غایۃ المقصود ص۲ ووفیات الأعیان ج۲ ص۱۳۹ [۲] فیض الباری ج۱ ص۵۸
[۳] مقدمۂ بذل المجہود، ۱/۱۸۱ [۴] حوالۂ مذکور، ۱/۲۰۲

طرح ترجمہ ہے ''باب البول قائما'' ۱؎ اس میں حضرت ابوحذیفہؓ کی روایت ''أتیٰ سباطة قوم فبال قائماً'' ذکرکر کے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی اباحت ثابت کی ہے جو امام احمدؒ کا مسلک ہے، حالانکہ ان کے علاوہ جمہور کے نزدیک بغیر عذر کے مکروہ ہے اور حنفیہ کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے، اور یہاں دوسری مشہور حدیث ذکر نہیں فرمائی جس سے بیٹھ کر ہی پیشاب کرنے کی تاکید نکلتی ہے، بلکہ اس کو اپنی کتاب میں دوسری جگہ ذکر فرمایا ہے، اسی طرح باب قائم کیا ہے ''باب في ترک الوضوء ممامست النار'' ۲؎ اور اس سے اگلا باب باندھا ہے ''باب التشدید في ذلك'' یعنی آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنا واجب ہے، امام ابوداؤد نے پہلے ترجمۃ الباب سے اشارہ کیا ہے اس بات کی طرف کہ حضرت جابرؓ کی حدیث ''کان اٰخر الأمر من رسول الله ﷺ ترک الوضوء مما غیرت النار'' کو جمہور نے ناسخ قرار دیا ہے لیکن چونکہ اسی حدیث کو مسئلۂ وضوء من لحوم الإبل میں بھی حنابلہ کے خلاف ائمہ ثلاثہ نے ناسخ قرار دیا ہے، اسی لئے امام ابوداؤد نے ''باب التشدید في ذلك'' کا باب قائم کرکے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ''ترك الوضوء مما غیرت النار'' حدیث جابرؓ سے منسوخ نہیں بلکہ اس کے نسخ کے لئے دوسرے دلائل موجود ہیں، اور مثلاً باب قائم کیا ہے ''باب في القطع في العارية إذا جحدت'' ۳؎، اس میں مصنفؒ نے امام احمدؒ کے مسلک کی پوری تائید کی ہے، اس لئے کہ امام احمدؒ کے نزدیک جمہور کے خلاف خائن خیانت کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا حالانکہ اس سے پہلے ہی باب میں ''لیس علی

۱؎ بذل المجهود، ۲۴۵/۱ ۲؎ بذل المجهود، ۸۲/۲ ۳؎ حوالۂ مذکور، ۶۹/۱۲

الخائن القطع'' والی روایت کوذکر کیا ہے جس سے أئمہ ثلاثہ کا استدلال ہے [1]۔

اسی طرح انہوں نے ترجمہ قائم کیا ہے ''**باب الوضوء بفضل طهور المرأة**'' [2]، اس کے بعد ترجمہ باندھا ہے ''**باب النهي عن ذلك**''، أئمۂ اربعہ میں سے یہ صرف امام احمدؒ کا مذہب ہے کہ عورت کے غسل یا وضوء سے بچے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال دے اوراس کو استعمال کرلے تو بقیہ پانی مرد کے لئے مستعمل ہوگیا [3]۔

غرض یہ ہے کہ اس طرح کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پوری طرح امام موصوف کا حنبلی المسلک ہونا متعین ہوجاتا ہے۔

تصنیفات ''سنن''، ''مراسیل'' ط، ''الرد علی القدریہ''، ا''لناسخ والمنسوخ''، ''ماتفرد بہ أہل الأمصار''، ''فضائل الأنصار''، ''مسند مالک بن أنسؓ''، ''المسائل'' ط، ''معرفة الأخوات والإخوة'' وغیرہ [4]، ''کتاب بدء الوحی'' [5]، ''أعلام المحدثین'' میں ۲۱ رکتابوں کا ذکر ہے، جس میں سب سے زیادہ اہم ان کی ''سنن'' ہے جس پر اگلے صفحات میں ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

سنن کا زمانۂ تالیف کہیں متعین طور سے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کس سن میں امام موصوفؒ ''سنن'' کی تالیف سے فارغ ہوئے، لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ جب ''سنن'' کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو اپنے اساتذہ امام احمدؒ وغیرہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اس کو پسند فرمایا [6]، اور امام احمدؒ کا سن وفات ۲۴۱ھ ہے،

---

[1] بذل ج۱ص۴۳۱ [2] بذل المجہود ۱/۴۳۸ ومقدمۂ لامع ص۴۷ [3] بذل ج۵ص۱۵
[4] تدریب ۲۲۰ [5] تہذیب التہذیب ج۱ص۴۹ [6] مرقاۃ ج۱ص۲۲

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک تالیف سے فارغ ہو چکے تھے [۱]۔

سنن أبي داود کی وجہ تالیف | امام ابوداود نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں تو انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ فن حدیث میں ایک نئے انداز کی کتاب کی ضرورت ہے جس میں ان احادیث کا استیعاب ہو جن سے أئمہ نے اپنے مذاہب پر استدلال کیا ہے، اس کی خاص وجہ تھی جیسا کہ علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت ایسی تھی جس نے ضبط وحفظ میں پوری توجہ کی، لیکن اس نے نہ تو مسائل کے استنباط کی طرف توجہ کی اور نہ ان خزانوں سے احکام نکالنے کی کوشش کرتی تھی جو اس نے محفوظ کر رکھا تھا، اور اس کے بالمقابل ایک جماعت ایسی تھی جس نے اپنی پوری توجہ استنباط مسائل اور اس میں غور وفکر کی طرف رکھی تھی [۲]، یہاں تک کہ ناقلین حدیث کی پہلی جماعت جو فتویٰ دینے سے بھی احتراز کرتی تھی، ان کا مقصد صرف حضور ﷺ کی احادیث کو روایت کرنا تھا اور یہ حضرات ائمۂ مجتہدین کی فقہی باریکیوں سے ناواقف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معتقدین میں سے بعد کے کچھ لوگوں نے ائمہ پر نقد شروع کر دیا جیسے حمیدی نے امام ابوحنیفہؒ پر اور احمد بن عبداللہ العجلی نے امام شافعیؒ پر سخت تنقید کی اور کہا کہ وہ قابل اعتماد ہیں لیکن انھیں حدیث سے واقفیت نہیں، ابوحاتم رازی نے کہا کہ **''كان الشافعي فقيهاً ولم يكن له معرفة بالحديث''** [۳] اس لئے امام ابوداود نے فقہاء کے مستدلات کو اپنی اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

امام ابوداود خود فرماتے ہیں کہ میری اس کتاب کے اندر مالکؒ، ثوریؒ، شافعیؒ

---

[۱] مقدمۂ لامع ص ۱۳۸ [۲] الوابل الصیب ۸۴۳/۳ [۳] ما تمس إلیہ الحاجۃ ۷۵، ۷۶

وغیرہ کے مذاہب کی بنیادیں موجود ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی احادیث کو یک جا کر دیں جن سے فقہاء استدلال کرتے ہیں اور ان میں مروج ہیں اور جن کو علمائے بلاد نے احکام کی بناء قرار دیا، اس مقصد کے لئے امام ابوداود نے اپنی ''سنن'' کو تصنیف کیا[1]، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک مجتہد کے لئے یہ کافی ہے، احکام کے استیعاب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے[2]۔

سنن کی مقبولیت اس لئے ہر زمانے میں علماء وفقہاء نے ''سنن'' ابی داود کی طرف پوری توجہ کی، یہاں تک کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اور مصنف نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا تو بہت زیادہ مقبول ہوئی، امام خطابیؒ نے لکھا ہے کہ ''سنن'' ابی داوٗد جیسی کتاب علم دین کے متعلق ابھی تک نہیں لکھی گئی، علامہ ابن القیمؒ کی رائے ہے کہ امام موصوف نے ایسی کتاب لکھی ہے جو مسلمانوں کے درمیان حَکَم ثابت ہوئی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کُن بن گئی، بعض بزرگوں نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا جو سنت پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے ''سنن'' ابی داوٗد پڑھنا چاہئے[3]۔

علماء نے مصنفؒ کی زیارت کے لئے رخت سفر باندھا، سہل تستریؒ جو اس زمانہ کے اہل اللہ میں سے تھے، مصنفؒ کی زیارت کے لئے آئے تو امام موصوف نے ان کے حکم سے اپنی زبان مبارک کو نکالا تو انہوں نے بوسہ لیا[4]۔

سنن ابی داود کا صحاح ستہ میں مرتبہ اس کے بعد اب یہاں ہم کو دو حیثیت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۳۵۰ [2] تدریب الراوی ص ۹۹

[3] تذکرۃ الحفاظ ۱۶۹/۲ [4] مقدمۂ غایۃ المقصود ص ۶

سے گفتگو کرنی ہے، ایک تو یہ کہ تعلیم کے لحاظ سے ''صحاح ستہ'' کے درمیان اس کا کیا مقام ہے؟ دوسرے یہ کہ صحت کے اعتبار سے اس کا کیا درجہ ہے؟

تعلیم کے اعتبار سے صحاح ستہ میں مقام | تعلیم کے لحاظ سے اس کا مقام معلوم کرنے سے پہلے ''صحاح ستہ'' کے مقاصد ناظرین کے سامنے آجائیں تاکہ اس کی تعیین آسان ہو جائے، چونکہ ''صحاح ستہ'' کے مؤلفین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنی کتابوں کا انتخاب کیا ہے، حضرت امام بخاریؒ کے پیش نظر طرق استنباط و استخراج مسائل ہیں جو ان کے تراجم ابواب سے ظاہر ہے، اہل درس کا مشہور مقولہ ہے کہ ''بخاری کی ساری کمائی ان کے تراجم میں ہے''۔

اسی طرح امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صحیح احادیث کو مختلف اسانید سے یک جا بیان کر دیا ہے، امام ابوداودؒ نے ائمہ کے مستدلات کو موضوع قرار دیا، امام ترمذیؒ کا مقصد بیان مذاہب ہے اور امام نسائیؒ کی غرض علل حدیث پر تنبیہ کرنا ہے، ابن ماجہؒ نے غیر معروف روایات کو بیان کرنا اپنے پیش نظر رکھا[1]۔

اوپر کی گفتگو سے ہمارے سامنے ان کتابوں کے اغراض و مقاصد آگئے ہیں، اس لئے ''مشکوٰۃ شریف'' کے بعد ''ترمذی شریف'' کی تعلیم دینی چاہئے کیونکہ سب سے پہلے طالب علم کو ائمہ کے مذاہب معلوم ہونے چاہئیں، پھر مزید برآں ائمہ کے دلائل جاننے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ''سنن أبي داود'' کا وظیفہ ہے، پھر طرق استنباط و طرز استدلال معلوم ہونا چاہئے، اس کے لئے ''صحیح بخاری'' کا وظیفہ ہے، پھر اس کے بعد مزید تائید کے لئے ''مسلم شریف'' کو پڑھانا چاہئے، کیونکہ وہ صحیح احادیث کو مختلف

---

[1] ماخوذ از مقدمۂ لامع ص۲۵ بحوالہ تدریب

اسانید سے یک جا روایت کرتے ہیں، پھر علل حدیث جاننے کے لئے ''نسائی'' کا مقام ہے، جہاں وہ " ھذا منکر و ھذا صواب " کہتے ہیں وہاں معرکہ پیش آجاتا ہے، پھر کھرے وکھوٹے کے جاننے کے لئے ''سنن ابن ماجہ'' کا درجہ ہے، اس گفتگو سے اب یہ بالکل واضح ہوگیا کہ تعلیم کے لحاظ سے ''سنن ابی داوٗد'' کا دوسرا درجہ ہے [۱]۔

صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے مقام | یہ بات متفق علیہ ہے کہ ''صحیحین'' کو ''سنن اربعہ'' پر صحت کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہے لیکن اس کے بعد کی ترتیب میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات نے ''نسائی شریف'' کو تیسرا درجہ دیا ہے اور بعض نے ''جامع ترمذی'' کو [۲]، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جہاں کتب حدیث کے طبقات بیان کئے ہیں وہاں ''سنن اَبی داوٗد'' کو دوسرے طبقے میں شمار کیا ہے، لیکن صاحب ''مفتاح السعادہ'' نے لکھا ہے کہ سب سے اونچا درجہ ''بخاری شریف'' کا ہے، اس کے بعد ''صحیح مسلم'' کا اور پھر ''سنن اَبی داوٗد'' کا درجہ ہے اور یہی زیادہ مناسب ترتیب ہے، کیونکہ علامہ ابن جوزیؒ نے ''جامع ترمذی'' کی تیئیس احادیث، ''سنن نسائی'' کی دس اور ''سنن اَبی داوٗد'' کی نو احادیث کو موضوع قرار دیا ہے [۳]، اگرچہ علامہ موصوف نقد روایت میں متشدد مانے گئے ہیں اور علماء نے اکثر کا جواب دیا ہے لیکن اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑے گا اس لئے بھی ''سنن اربعہ'' میں ''سنن اَبی داوٗد'' کو صحت کے لحاظ سے تقدم حاصل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں رجال کے تین طبقات قائم کئے ہیں جن کے متعلق حاکم وبیہقی نے لکھا ہے کہ انہوں نے صرف پہلے ہی طبقہ کی

---

[۱] افادات حضرت الاستاذ [۲] معارف السنن ج۱ ص۱۱۴ [۳] مقدمۂ لامع ص۶۳

روایات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے لیکن قاضی عیاضؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے طبقۂ ثانیہ کی روایات کو بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے، علامہ نوویؒ نے ان کے قول کی تحسین کی ہے، البتہ طبقۂ ثالثہ کی روایات موجود نہیں، حضرت گنگوہیؒ نے اپنی تقریر مسلم میں فرمایا ہے کہ طبقۂ ثالثہ کی روایات کو بھی ضمناً واستشہاداً بعض جگہ بیان کردیا ہے، بہرکیف طبقۂ اولیٰ وثانیہ کی روایات ''مسلم شریف'' میں موجود ہیں، اس پر ابن سیّد الناسؒ نے لکھا ہے کہ امام ابوداؤد نے بھی ضعیف اور ناقابل اعتبار روایات سے گریز کیا ہے، اور جہاں کہیں ضعف شدید ہے تو اس کی وجہ بیان کردی ہے، نیز قسم اول وثانی کی روایات بکثرت اپنی کتاب میں لائے ہیں، پس معلوم ہوا کہ دونوں کے شرائط ایک ہیں یعنی ''مسلم شریف'' میں صحیح اور حسن دونوں طرح کی روایات موجود ہیں، کیونکہ امام ابوداؤد نے اپنے خط میں جو اہل مکہ کے نام لکھا ہے اس میں اپنے ان شرائط کی صراحت کردی ہے [۱]۔

امام زین الدین العراقی نے اس کو تسلیم نہیں کیا کہ ان دونوں کے شرائط ایک ہیں، کیونکہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صحت کا التزام کیا ہے، ان کی کتاب کی کسی حدیث کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان کے نزدیک حسن ہے، اس لئے کہ حدیث حسن کا درجہ صحیح سے نیچا ہے، اور امام ابوداؤد کا مشہور قول ہے کہ ''**ما سکت عنه فهو صالح**''، جس حدیث سے میں سکوت اختیار کروں وہ قابل استدلال ہے، اس میں حسن وصحیح دونوں کا احتمال ہے، امام ابوداؤد سے کہیں یہ منقول نہیں جس کو میں صالح کہوں وہ صحیح ہے [۲]، اس کے علاوہ امام زہریؒ کے تلامذہ کے پانچ طبقات ہیں، امام

---

[۱] شروط الأئمہ ص ۵۵ [۲] تدریب ص ۵۶ وشروط الأئمہ ۵۳

مسلمؒ نے طبقۂ ثانیہ کی روایات کو اصالۃً ذکر کیا ہے اور ثالثہ کی ضمناً اور امام ابوداود طبقۂ ثالثہ کی روایات کو اصالۃً لائے ہیں [۱]، ان وجوہ کی بنا پر ''سنن ابی داود'' کا مقام ''صحیح مسلم'' کے بعد ہی رکھا جائے گا جیسا کہ علامہ نوویؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ترتیب قائم کی ہے، بخاری، مسلم، پھر سنن ابی داوٗد، اس کے بعد نسائی پھر ترمذی و ابن ماجہ کا درجہ ہے [۲]۔

سنن ابی داوٗد کی خصوصیات کتب ستہ کی علیٰحدہ علیٰحدہ کچھ خصوصیات ہیں، اس لئے کہ ہر کتاب کے مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی نئی اور کارآمد بات ایسی ہو جو دوسری کتابوں سے اس کو ممتاز کر دے، اس کی تفصیل ہر ایک کے حالات کے ساتھ کی جائے گی، فی الحال ہمارے پیش نظر ''سنن أبي داود'' کی خصوصیات کو بیان کرنا ہے، پورا مضمون اور بالخصوص یہ حصہ حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیثؒ کے افادات سے ماخوذ ہے، جو ''بذل المجهود'' کی تصنیف میں شروع سے اخیر تک شریک رہے ہیں اور مزید برآں پینتیس سال تک ''سنن أبي داوٗد'' کا درس دیا ہے۔

① مصنف کبھی ایک ہی سند میں مختلف اسانید کو بیان کر دیتے ہیں، اسی طرح کبھی ایک متن میں مختلف متون کو اکٹھا کر دیتے ہیں، پھر ان میں سے ہر حدیث کے الفاظ کو علیٰحدہ علیٰحدہ بیان فرماتے ہیں، جیسے مسدّد بن مسرہد نے حماد بن زید اور عبدالوارث دونوں ہی سے روایت کیا ہے، تو مصنف نے دونوں کے الفاظ کو علیٰحدہ علیٰحدہ **عن وارث و عن حماد** کہہ کر بیان کر دیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ

---

[۱] تدریب ص ۱۴۱ [۲] مقدمۂ لامع ص ۴۷ و مقدمۂ بذل المجهود ج ۱ ص ۱۲۳

دونوں کے الفاظ کا اختلاف ظاہر ہو جائے، اور یہ دونوں ہی مسدّد کے استاذ ہیں[۱]۔

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد ہے کہ ان کے اصولوں میں سے یہ ہے کہ جب کسی راوی کے الفاظ میں کوئی زیادتی یا کمی یا تغیر واقع ہوتا ہے یا راوی کا کوئی وصف وغیرہ بیان کرنا چاہتے ہیں تو اس کو دوسری روایت سے علیٰحدہ کر دیتے ہیں اور جملۂ معترضہ کے طور پر اثنائے سند یا اثنائے متن میں یا آخر سند میں اسی کو بیان کرتے ہیں، اسی طرح جب دو اسناد ایک راوی پر جمع ہو جاتی ہیں تو اگر ایک نے ''حَـدَّثنا'' کے ساتھ روایت کیا اور دوسرے نے ''عَنْعَنَہ'' سے تو پہلے ''حدثنا'' والی روایت کو مقدم کرتے ہیں اور ''عنعنہ'' کو مؤخر کرتے ہیں[۲]۔

② اسی طرح امام موصوف نے فرمایا ہے کہ وہ حدیث طویل کو کبھی مختصر بیان کرتے ہیں، کیونکہ اگر پوری حدیث ذکر کر دی جائے تو بعض سننے والے اس کی فقاہت کو سمجھ نہ سکیں گے۔

③ انھوں نے فرمایا ہے کہ جب وہ دو یا تین حدیثیں ایک باب میں ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصد کسی خاص نقطۂ نظر کو بیان کرنا ہوتا ہے جو پہلی روایت میں موجود نہیں یا کسی روایت میں کسی خاص حیثیت سے مزید کلام کی ضرورت ہوتی ہے تو متعدد احادیث کو باب کے تحت لاتے ہیں، ورنہ اختصار ہی سے کام لیتے ہیں۔

④ انھوں نے فرمایا کہ صرف دس جگہیں ہیں کہ جہاں اقدم کی روایت کو احفظ کی روایت پر مقدم کیا ہے۔

⑤ اسی طرح کبھی ایک ترجمہ کے تحت مختلف روایات کو جمع کر دیتے ہیں جیسا کہ

---

[۱] بذل ج۱ص۳۰ [۲] مقدمۂ بذل المجہود ج۱ص۱۲۳

''**باب كراهة استقبال القبلة عند قضاء الحاجة**'' میں ''**استدبار عند الحاجة**'' کی روایت بھی لائے ہیں۔

⑥ اور کبھی ''**ترجمة الباب**'' اس طور پر قائم کرتے ہیں کہ خود ترجمہ کے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ احادیث سے ثابت شدہ حکم کے اندر یہ چیزیں بھی شامل ہیں، جیسے ''**ترجمة الباب**'' لائے ہیں ''**باب المواضع التي نهي عن البول فيها**''، حالانکہ حدیث کے اندر کہیں بول کا تذکرہ نہیں ہے، صرف براز کا تذکرہ موجود ہے لیکن چونکہ دونوں لازم وملزوم ہیں اس لئے ترجمہ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کردیا کہ دونوں کے اندر علتِ ممانعت ایک ہے، بَراز کے ساتھ بول بھی شامل ہے۔

⑦ اسی طرح امام موصوف کی ''سنن'' میں ایک حدیث ثلاثی بھی ہے جب کہ سند عالی کی محدثین کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے، چنانچہ امام بخاریؒ کی ثلاثیات بہت مشہور ہیں اور انھیں ان کی کتاب کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے وہ ابو برزہ[۱] کی حدیث ہے، جو **كتاب السنة** ''**باب الحوض**'' کی آخری حدیث ہے جو رباعی ہے مگر درحقیقت ثلاثی کے حکم میں ہے[۲]۔

⑧ امام ابوداؤدؒ نے جس فضا میں آنکھیں کھولیں دولتِ عباسیہ اپنے شباب پر تھی اسلامی تہذیب وثقافت کے آبِ صافی میں ایرانی تہذیب وثقافت کی کثافت مل کر اسے گدلا کررہی تھی، امام صاحبؒ نے کوشش کی کہ امتِ اسلامیہ عجمی اثرات سے محفوظ رہے، اس مقصد کے پیشِ نظر اپنی ''سنن'' میں کتاب الآداب کو ایک ممتاز درجہ دے دیا۔

تعداد روایات | امام ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ احادیث کے مجموعہ میں سے صرف چار

---

[۱] رقم حدیث ۴۷۴۹ [۲] المنهل العذب المورود ج۱ ص۲۰

ہزار آٹھ سو کا اپنی کتاب میں انتخاب کیا ہے، مزید برآں چھ سو مراسیل بھی ہیں، نیز امام شافعیؒ کے سوا مرسل حدیث جمہور کے نزدیک قابل حجت ہے، امام ابوداودؒ اور ان کے استاذ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

صرف چار احادیث انسان کے دین کے لئے کافی ہیں امام ابوداودؒ نے اتنی روایات میں سے صرف چار کا انتخاب فرمایا کہ انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے صرف یہ حدیثیں کافی ہیں۔

(۱) "إنما الأعمال بالنيات".	تمام اعمال کی مقبولیت کا دار و مدار صرف نیتوں پر ہے۔
(۲) "من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه".	انسان کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔
(۳) "لايكون المؤمن مؤمنا حتى يرضى لأخيه ما يرضى لنفسه".	مومن، حقیقی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
(۴) "الحلال بيّن و الحرام بيّنٌ" إلخ .	حلال وحرام واضح ہیں، مگر ان کے درمیان بعض مشتبہ و مشکوک چیزیں بھی ہیں، جو ان سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر سکے گا۔

اگرچہ حافظ ابن حجرؒ نے "النصح لكل مسلم" والی روایت کے متعلق کہا

ہے کہ چار بنیادی حدیثوں میں سے اس کو بھی شمار کیا گیا ہے اور اس کی تائید میں امام احمد بن اسلم الطّوسی کا قول پیش کیا ہے ۱؎، لیکن علامہ نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کو چار احادیث میں ایک شمار کیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ تو سب کی جامع ہے اور اس پر اسلام کا مدار ہے۔

الغرض امام ابوداؤدؒ نے ان چار حدیثوں کو انسان کے دین کے لئے کافی بتایا ہے، واقعہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ زندگی کے سارے معاملات پر حاوی ہیں چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ کافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے مشہورات وقواعد کلیہ جاننے کے بعد جزئیات دین کو معلوم کرنے کے لئے کسی مجتہد کی ضرورت باقی نہیں رہتی، چونکہ حدیث اول عبادات کی درستگی کے لئے کافی ہے، اور حدیث ثانی سے عمر عزیز کے اوقات کی محافظت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے تیسری حدیث سے حقوق کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں و متعارفین اور اہل معاملہ کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے، اور چوتھی حدیث ایسے مسائل میں جن میں علماء کو شک وتردد ہے، ایک واضح راستہ پیش کرتی ہے، غرض یہ کہ یہ چاروں حدیثیں ایک عاقل آدمی کے لئے استاذ وشیخ کا درجہ رکھتی ہیں ۲؎۔

لیکن فی الواقع امام ابوداؤدؒ سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے صاحبزادہ حمادؒ سے فرمایا تھا کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث کے مجموعہ میں سے پانچ احادیث کا انتخاب کیا ہے، چار تو وہی ہیں جن کو امام ابوداودؒ نے بیان کیا ہے اور پانچویں حدیث یہ ہے "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہ ویدہ" إلخ چونکہ امام ابوداودؒ

۱؎ فتح الباری ج ۱ ص ۱۰۳ ۲؎ الحطہ ص ۱۰۵ و بستان ص ۱۱۹

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے فضل وامامت کے قائل ہیں، چنانچہ ان کا مشہور قول ہے:

"رحـم الله أبـا حـنيـفة أن كـان إماماً". اللہ رحم کرے ابوحنیفہؒ پر وہ امام تھے۔

ابن عبدالبر نے "الانتقاء" میں اس کو نقل کیا ہے، اس لئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے امام صاحبؒ کے قول کو اپنے سامنے رکھ کر ان چار حدیثوں کا انتخاب فرمایا ہو[۱]۔

ما سکت عنہ أبو داود کی حیثیت | اس کتاب کے اندر یہ مسئلہ بھی نہایت ہی معرکۃ الآراء ہے کہ جن احادیث پر امام موصوف سکوت اختیار فرمائیں ان کی حیثیت کیا ہوگی، کیونکہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ "**مالم يذكر فيه شيئا فهو صالح**"، جس کے بارے میں وہ سکوت اختیار کریں وہ صالح ہے یعنی قابل استدلال ہے اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ البتہ ان میں صحت کے اعتبار سے تفاوت ہے، بعض بعض کے مقابل میں زیادہ صحیح ہیں، اب قابل استدلال ہونے میں حسن وصحیح دونوں ہی کا احتمال ہے، لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو حسن ہی قرار دیا جائے۔

علامہ نوویؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ ان پر عمل کرنا جائز ہے بشرطیکہ قابل اعتماد محدثین نے بھی سکوت فرمایا ہو[۲]، قاضی شوکانیؒ نے نقل کیا ہے کہ علامہ نوویؒ وابن صلاحؒ وغیرہ حفاظ حدیث نے جن احادیث پر ابوداؤدؒ نے سکوت اختیار کیا ہے، عمل کرنا جائز بتایا ہے، البتہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ صحت وحسن کے خلاف کوئی چیز ملے گی تو پھر ہم اس پر عمل ترک کردیں گے اور شیخ ابن صلاحؒ نے کہا کہ جو حدیث ہم ان کی کتاب میں

---

[۱] مقدمۂ بذل المجہود ج۱ ص۲۲ [۲] تدریب ص۵۵

مطلقاً بغیر فیصلہ کے پائیں گے اور اس کی صحت بھی ہمیں معلوم نہیں تو ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ امام موصوف کے نزدیک حسن ہے کیونکہ جس سے امام ابوداودؒ نے سکوت اختیار فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک حسن وصحیح دونوں کا احتمال رکھتی ہے ۱؎۔

لیکن ابن مندہؒ کی رائے یہ ہے کہ ابوداودؒ کو جب کسی باب میں ضعیف حدیث کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں ملی تو اسی کو لائے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ لوگوں کی رائے سے زیادہ قوی ہے، ان کے استاذ امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک تھا کہ لوگوں کی رائے سے زیادہ عزیز حدیث ہے خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، وہ قیاس کا راستہ اس وقت تلاش کرتے تھے جب کہیں کوئی نص نہ مل سکے ۲؎۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک رائے کے مقابل میں حدیث ضعیف کے عزیز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روایت باطل ومنکر نہ ہو اور اس میں کوئی ایسا راوی نہ پایا جائے کہ جس سے روایت جائز ہی نہیں، اور فی الواقع ایسی ضعیف حدیث سے استدلال تو امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ و شافعیؒ بھی کرتے ہیں ۳؎، اسی لئے بعض لوگوں کی رائے یہ کہ امام ابوداودؒ کے قول "**فما سکت عنه فهو صالح**" کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث استشہاد و اعتبار کے قابل ہے، اس کو دوسری حدیث کی تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے، پھر ایسی صورت میں حدیث ضعیف بھی شامل ہوجائے گی، مگر علامہ ابن کثیرؒ نے امام ابوداودؒ کا قول صریح نقل کیا ہے "**ما سکت عنه فهو حسن**"، جس سے میں نے سکوت اختیار کیا ہے وہ حسن ہے، اس لئے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا ۴؎۔

۱؎ نیل الأوطار ج۱ص۱۵ ۲؎ تدریب ص۵۵ ۳؎ إعلام الموقعین ج۲ص۲۵ ۴؎ تدریب ص۵۵

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ منذریؒ نے پوری توجہ ان احادیث کے نقد کے بارے میں کی ہے جو ''سنن أبي داوٗد'' کے اندر مذکور ہے اور بہت سی مسکوت عنہا احادیث کا ضعف بھی بیان کردیا ہے، پس وہ احادیث اس سے خارج سمجھی جائیں گی اور بقیہ پر عمل کیا جائے گا، پس جب یہ دونوں ہی سکوت اختیار کریں پھر بلاشبہ وہ حدیث قابل استدلال ہوگی، لیکن چند جگہیں مستثنیٰ ہیں جن کو میں اپنی اس شرح میں بیان کروں گا[۱]۔

اسی طرح علامہ ابن قیمؒ نے بھی چند احادیث پر نقد کیا ہے:

اس لئے بعض حضرات کا خیال ہے کہ ''سنن أبي داوٗد'' کی وہ احادیث قابل استدلال ہوں گی جن پر منذریؒ وابن قیمؒ دونوں ہی نے سکوت کیا ہو۔

لیکن ''سنن ابي داوٗد'' کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا یہ خیال ہے کہ بیشک منذریؒ و ابن قیمؒ کی نقد کردہ احادیث کے علاوہ بھی بہت سی حدیثوں کو جن پر ان حضرات نے سکوت کیا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ قابل استدلال ہیں، مگر ان سب کے باوجود ہمیں بعض احادیث ایسی بھی ملتی ہیں کہ جن پر ان سب نے سکوت اختیار کیا ہے اور فی الواقع وہ ضعاف ہیں، مثال کے طور پر مصنفؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ ''رأيت ابن عمرؓ أناخ راحلته'' إلخ[۲]، اس کے بارے میں امام ابوداوٗدؒ نے سکوت اختیار کیا ہے، اسی طرح منذری نے ''تخریج'' میں اور ابن قیم نے بھی اس میں سکوت فرمایا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا، حافظؒ نے بھی ''تلخیص الحبیر'' میں اس کے متعلق سکوت اختیار کیا۔

البتہ ''فتح الباری'' میں صرف اتنا فرماتے ہیں کہ اس کی تخریج ابوداوٗدؒ اور حاکمؒ نے حسن سند سے کی ہے، لیکن ان حضرات کے سکوت پر تعجب ہے، کیونکہ اس کے راوی

---

[۱] نیل الأوطار ج۱ ص۱۲ [۲] بذل ج۱ ص۱۸۳

حسن بن ذکوان کی بہت سے محدثین نے تضعیف کی ہے، ابن أبي الدنیاؒ نے کہا کہ ''لیس هو القوي عندي'' وہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے و قال أحمد : ''أحادیثه أباطیل'' ،اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی احادیث باطل ہیں، اور یحییٰ بن سعید اور ابوحاتم نے اس کو ضعیف کہا اور ابوحاتم ونسائی کے نزدیک وہ قوی نہیں ہے، عبدالرحمٰن اس سے کبھی روایت نہیں کرتے [۱]، پس ان وجوہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ جن پر یہ سب حضرات سکوت فرمائیں اس کی مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے اور اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

سنن أبي داود پر ابن جوزیؒ کی تنقید علامہ سیوطی کی رائے یہ ہے کہ ''سنن أبي داوٗد'' کی نو حدیثیں ایسی ہیں جن کو ابن جوزیؒ نے موضوع قرار دیا ہے، لیکن علامہ موصوف نے چار روایات کا جواب ''القول الحسن في الذب عن السنن'' میں دیا ہے اور بقیہ کا'' التعقبات علی الموضوعات'' میں، مگر علامہ ابن جوزیؒ نقد روایات میں متشدد قرار دیئے گئے ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب ''الموضوعات'' میں بہت سی ایسی حدیثوں کو موضوع کہہ دیا ہے جن کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ضعیف ہیں۔

علامہ ذہبیؒ کی رائے ہے کہ ابن جوزیؒ نے بہت سی قوی اور حسن روایات کو بھی کتاب ''الموضوعات'' میں داخل کر دیا ہے [۲]، شیخ الإسلام حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ابن جوزیؒ کا نقد روایات میں تشدد اور حاکمؒ کے تساہل نے ان دونوں کی کتابوں کے نفع کو مشکل بنادیا ہے، اس لئے کہ ان دونوں کتابوں کی ہر حدیث میں تساہل کا

---

[۱] تدریب ص۱۰۱ [۲] تدریب طبع قدیم ص۱۰۱

امکان ہے، پس ناقل کو ان دونوں سے نقل میں احتیاط کی ضرورت ہے، مجرد ان دونوں کی تقلید مناسب نہیں [۱]۔

پس معلوم ہوا کہ علامہ موصوفؒ کا ہر حدیث کے متعلق وضع کا فیصلہ نامناسب ہے، امام ابوداودؒ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے اپنی ''سنن'' میں جس کو میں نے لکھا ہے کوئی روایت متروک الحدیث راوی سے نہیں لی ہے، اور اگر کہیں حدیث منکر ہے تو میں نے اس کو بیان کر دیا ہے، اسی طرح اگر کسی حدیث میں ضعف شدید ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی ہے [۲]، امام موصوفؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی ہے جس کے ترک پر سب کا اجماع ہو [۳]، امام خطابیؒ جو ''سنن أبي داوٗد'' کے شارح بھی ہیں، ان کا ارشاد ہے کہ اس کتاب میں حسن وصحیح دونوں طرح کی روایات ہیں، باقی سقیم روایات تو اس کے متعدد طبقات ہیں جن میں سب سے بُرا طبقہ موضوع احادیث کا ہے، پھر مقلوب کا اور اس سے کم تر مجہول کا درجہ ہے، لیکن ابوداوٗدؒ کی کتاب ان سب سے خالی ہے بلکہ ان کے وجود سے پاک ہے [۴]۔

سنن کے نسخے | ''سنن أبي داوٗد'' کو متعدد حضرات نے امام موصوفؒ سے روایت کیا ہے لیکن ان میں چار حضرات کے نسخے زیادہ مشہور ومعروف ہیں۔

① ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤیؒ متوفی ۳۲۱ھ کا نسخہ ہندوستان و بلاد مشرق میں اس کو زیادہ شہرت ہے، لؤلؤی کے نسخہ کو اس حیثیت سے ترجیح حاصل ہے کہ انھوں نے کتاب ''السنن'' کا سماع محرم ۲۷۵ھ میں کیا ہے، جب کہ امام ابوداود نے اس کی آخری املاء کرائی تھی،

---

[۱] التعقبات علی الموضوعات ص ۱ [۲] شروط الأئمۃ ص ۵۵

[۳] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۲ [۴] الحطہ ص ۱۱۶

کیونکہ اسی سال بروز جمعہ ۱۶ر شوال کو امام موصوف نے سفر آخرت اختیار کیا ہے۔

② ابو بکر محمد بن بکر بن عبد الرزاق بن داسہ المتوفی ۳۴۵ھ کا نسخہ، ابن داسہ اور لؤلؤی کے نسخوں میں گو ترتیب کے اعتبار سے کچھ تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے، لیکن تعداد احادیث کے لحاظ سے یہ نسخے قریب قریب ہیں، البتہ احادیث پر امام ابو داؤدؒ نے جو کلام کیا ہے وہ بعض نسخوں میں زیادہ اور بعض میں کم ہے۔

③ حافظ ابو عیسیٰ اسحٰق بن موسیٰ بن سعید رملی المتوفی ۳۱۷ھ کا نسخہ، یہ ابن داسہ کے نسخہ کے قریب قریب ہے۔

④ حافظ ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بہ ابن الأعرابیؒ المتوفی ۳۴۰ھ کا نسخہ، ان کے نسخوں میں کچھ حدیثیں کم ہیں، اس میں ''کتاب الفتن والملاحم'' اور بعض ابواب ساقط ہیں [۱]۔

سنن أبی داود کی شروح

''سنن أبی داؤد'' کی اہمیت اور اس کی افادیت کے پیش نظر علماء و محدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتناء کیا، اس کی متعدد شرحیں اور حواشی و مستخرجات لکھے گئے، حضرت الأستاذ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے تقریباً بائیس شروح و حواشی کا اپنے اِفادات میں ذکر فرمایا ہے، طوالت کے سبب ان کا تفصیلی تعارف کرانا یہاں مشکل ہے، البتہ چند مشہور و متداول شروح و حواشی یہ ہیں، ① ''معالم السنن'' للخطابیؒ ② ''مرقاۃ الصعود'' للسیوطیؒ، اس کی تلخیص علامہ دمنتی نے کی ہے جو ③ ''درجات مرقاۃ الصعود'' کے نام سے مشہور اور رائج ہے ④ ''المجتبیٰ للمنذریؒ'' ⑤ ''تہذیب السنن'' لابن القیمؒ ⑥ ''غایۃ المقصود'' للشیخ شمس الحق أبی

---

[۱] مقدمہ غایۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد ص ۷

الطیب العظیم آبادی، لیکن اس کا جزء اول ہی صرف طبع ہوسکا ہے، اوراس کی تلخیص ان کے بھائی شیخ محمد اشرف نے کی ہے، لیکن اخیر کتاب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف ہی نے اپنی شرح کی تلخیص کی ہے، یہ ⑦ ''عون المعبود'' کے نام سے چار جلدوں میں چھپ گئی ہے، ⑧ ''فتح الودود'' للسندیؒ، ⑨ ''التعلیق المحمود'' للشیخ فخر الحسن الکنکوہیؒ ⑩ ''بذل المجہود''، یہ شرح حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی ہے، جو اہل علم میں مشہور ومعروف ہے، یہ شرح ہماری تحقیق وتعلیق وفہارس کے ساتھ چودہ ۱۴؍ جلدوں میں بیروت سے شایع ہوئی ہے، (۱۱) ''المنہل المورود'' شرح سنن الإمام أبي داودؒ، ازمحمود خطاب سبکیؒ، یہ مفصل شرح ہے، دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے مگر کتاب کی تکمیل نہ ہوسکی کہ مؤلف کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ امین خطاب نے تکمیل کی کوشش کی ان کا تکملہ باب الطیرۃ رقم الحدیث ۳۹۲۵ تک پہونچا تھا کہ انتقال ہوگیا، اور کتاب نا تمام رہ گئی ہے، (۱۲) ''أنوار المحمود'' علی سنن أبي داود علامہ کشمیری کے ایک شاگرد مولانا عبدالہادی نجیب آبادی نے دو جلدوں میں جمع کیا ہے جو شائع ہوچکی ہے۔

اس ناچیز نے عربی میں '' **أبو داود الإمام الحافظ الفقيه** '' کے نام سے مستقل کتاب تالیف کی ہے جو دارالقلم دمشق سے متعدد بار شائع ہوچکی ہے۔ اور پورا رسالہ جدید بذل المجہود کی شرح کے ساتھ شائع ہوگیا ہے اس میں تقریبا چالیس شروح ومتعلقات کا تفصیلی ذکر ہے۔

امام ترمذیؒ

نام ونسب محمد نام اور ابوعیسیٰ کنیت ہے، قبیلہ سلیم سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا پورا نسب یوں بیان کیا جاتا ہے: محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی ترمذی بوغی۔
(لیکن سمعانی نے ان کے نسب نامہ میں بوغی کے بجائے شداد لکھا ہے ۱۔)

بوغی، قریۂ بوغ کی جانب منسوب ہے، بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذیؒ اسی میں آسودۂ خواب ہیں یہ ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر واقع ہے ۲۔

پیدائش ووفات امام موصوف ۲۰۹ھ میں مقام ترمذ ہی میں پیدا ہوئے، یہ ترمذ ایک قدیم شہر ہے جو دریائے جیحون کے ساحل پر واقع ہے ۳، اس کا تلفظ ترِمذ، ترَمذ اور تُرمذ تینوں طریقوں سے ہے لیکن اہل درس کے یہاں ترِمذ (بالکسر) ہی مشہور ہے ۴۔

آپ کا انتقال مشہور روایت کے مطابق ۲۷۹ھ میں یہیں ہوا، آپ نے ستر سال کی عمر پائی تھی ۵۔

---

۱ کتاب الأنساب ص۱۰۶ ۲ معجم البلدان ج۲ص۳۸۲ ۳ مرقاۃ ج۱ ص۲۱
۴ سیر أعلام النبلاء ج۱۳ص۲۷۴ ۵ اتحاف النبلاء ص۳۸۷

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جس دور میں پیدا ہوئے اس زمانے میں علم حدیث شہرت کے درجے کو پہونچ چکا تھا، بالخصوص خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقے مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث کی مسند علم بچھ چکی تھی۔

امام موصوفؒ نے جوں ہی شعور کی آنکھیں کھولیں انھیں علم حدیث کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوگیا، چنانچہ انہوں نے اس کے حصول کے لئے مختلف حصوں، علاقوں اور ملکوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''**طاف البلاد و سمع خلقا من الخراسانيين و العراقيين و الحجازيين**''[۱]۔

شیوخ امام ترمذیؒ نے اپنے زمانے کے ہر خرمنِ حدیث سے استفادہ کیا، اس لئے ان کے شیوخ کا استقصاء دشوار ہے، علامہ ذہبیؒ نے بخاریؒ، مسلمؒ، علی بن حُجر مروزیؒ ہناد بن سریؒ، قتیبہ بن سعیدؒ، محمد بن بشارؒ وغیرہم کو ان کے اساتذہ میں شمار کیا ہے، امام ابوداؤدؒ بھی ان کے شیوخ میں سے ہیں، البتہ امام احمدؒ سے سماع ثابت نہیں۔

آپ کے شیوخ میں ایسے حضرات بھی ہیں جن سے اکثر اصحاب صحاح نے استفادہ کیا، حافظ عراقی فرماتے ہیں:

> ''امام مسلمؒ اگرچہ امام ترمذیؒ کے استاذ ہیں مگر پوری کتاب میں صرف ایک روایت ان سے مروی ہے اور وہ روایت ''**أحصوا هلال شعبان لرمضان**'' والی ہے، اگرچہ اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے اپنے کسی معاصر سے روایت کی جاتی ہے کیونکہ دونوں کا بہت سے شیوخ میں اشتراک ہے[۲]۔''

---

[۱] تہذیب التہذیب ج۹ ص ۳۸۸ [۲] تذکرۃ الحفاظ ۲/۶۳۴، ومقدمہ تحفۃ الأحوذی ص ۳۴۲

امام بخاریؒ سے امام موصوفؒ کو زیادہ استفادہ کا موقع ملا، علامہ ذہبیؒ فرماتے :'' تفقه في الحديث بالبخاري'' یہاں تک کہ امام بخاریؒ کے مایۂ ناز تلامذہ میں ان کا شمار ہے، حاکم نے موسیٰ بن ملک کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

مات البخاري فلم يخلّف بخراسان مثل أبي عيسىٰ في العلم و الحفظ و الورع و الزهد''[1].

خود امام بخاریؒ کو بھی اپنے لائق شاگرد پر ناز تھا، انہوں نے ان کے کمال علم کی ان الفاظ میں سند عطا فرمائی تھی:

'' ما انتفعت بک أکثر مما انتفعت بي''[2].

مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہین شاگرد جب استاذ سے سوال کرتا ہے تو اس کی نگاہ دیگر علوم کی طرف جاتی ہے''[3]۔

امام بخاری نے دو حدیثیں امام موصوفؒ سے روایت کی ہیں:

(۱) کتاب التفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث '' في قول الله عزوجل: ما قطعتم'' کے تحت۔

(۲) حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث '' يا علي! لا يَحِلُّ لأحد أن يجنب في هذا المسجد غيري و غيرک''(في باب مناقب علي).

اور ان دونوں کی تخریج کے بعد فرمایا کہ سمع مني محمد بن إسمٰعيل[4].

---

[1] تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۸۹ [2] تہذیب حوالۂ مذکور

[3] العرف الشذی ص۲۸ [4] مقدمۂ تحفہ ص۱۶۷

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ترمذی شاگرد رشید بخاری است و روش اورا آموختہ، واز مسلم و ابو داود و شیوخ ایشاں نیز روایت دارد، و در بصرہ و کوفہ و واسط و رے و خراسان و حجاز سالہا در علم بسر بردہ[۱]۔

تلامذہ اوپر گزر چکا ہے کہ امام بخاریؒ کے انتقال کے بعد ابوعیسیٰؒ کے ہم پلہ خراسان میں کوئی محدث نہیں تھا، اس لئے ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی، ان کے تلامذہ میں خراسان و ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام درج ذیل ہیں:

ابوحامد احمد بن عبداللہ مروزی، ہیثم بن کُلیب شاشی، ابوالعباس محمد بن احمد بن محبوب مروزی، جنہوں نے ''جامع ترمذی'' کو امام موصوف سے روایت کیا ہے، احمد بن یوسف نسفی، عبد بن محمد بن محمود النسفی، محمد بن محمود اور داؤد بن نصر بن سہیل بزدوی وغیرہ۔

حافظہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے، امام موصوفؒ کو جس طرح اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا ویسے ہی خداداد قوتِ حافظہ بھی عطا کی گئی تھی، ابوسعد ادریسی فرماتے ہیں کہ ابوعیسیٰ کی قوتِ حفظ بھی مثالاً بیان کی جاتی تھی[۲]۔

ان کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی سب ہی کتابوں میں مذکور ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے دو جزء کے بقدر بواسطہ حدیثیں سنیں اور قلم بند کیں، حسن اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد ان کے شیخ سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے شیخ مذکور سے سماع حدیث

---

[۱] بستان ص ۱۲۰   [۲] مقدمہ تحفہ ص ۱۶۷

کی درخواست کی، شیخ نے سنانی شروع کی، اور امام ترمذیؒ سے فرمایا کہ لکھ لو، ترمذی بیاض لے کر بیٹھ گئے، مگر قلم میں روشنائی نہیں لی تھی، یوں ہی بیاض پر قلم چلاتے رہے، شیخ کو شبہہ ہوا کہ یہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ یوں ہی قلم پھیر رہے ہیں، اٹھ کر دیکھا تو بیاض سادی تھی، بے حد خفا ہوئے اور فرمایا: تم مذاق کرتے ہو، امام ترمذیؒ نے عرض کیا آپ گھبرائیے نہیں! جتنی حدیثیں آپ نے سنائی ہیں سب مجھے یاد ہیں سن لیجئے، چنانچہ تمام حدیثیں فرفر سنا دیں، شیخ کو خیال ہوا کہ شاید یہ ان کو پہلے سے یاد تھیں، انہوں نے باور نہیں کیا، امام ترمذیؒ نے عرض کیا کہ آپ دوسری حدیثیں سنایئے، میں ان کو بھی سنا دوں گا، چنانچہ شیخ نے اپنے غرائب الحدیث سے چالیس حدیثیں سنائیں جن کو امام ترمذیؒ نے فوراً ہی دہرا دیا، تب شیخ کو ان کی قوتِ حافظہ کا یقین ہوا[۱]۔

زہد وتقویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''تورع و زہد بحدے داشت کہ فوق آں متصور نیست و بخوف الٰہی بسیار گریہ وزاری کردو نابینا شد''[۲]۔

یعنی زہد وتقویٰ اس درجہ کا حاصل تھا کہ اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور خوفِ الٰہی سے بکثرت گریہ وزاری کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ وہ مادرزاد اندھے پیدا ہوئے تھے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے[۳]۔

۱۔ بستان ص ۱۲۱ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۳ ص ۲۷۳ ۲۔ بستان ص ۱۰۹

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸

تنبیہ | شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ امام موصوفؒ کا نام محمد اور کنیت ابو عیسیٰ تھی لیکن انہوں نے اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت زیادہ استعمال کی ہے جیسے فرماتے ہیں: قال أبو عیسیٰ إلخ مگر بعض علماء نے اسے مکروہ سمجھا ہے، چنانچہ ابن ابی شیبہ اپنی ''مصنف'' میں ترجمۃ الباب لائے ہیں'' **باب ما یکرہ للرجل أن یکتني بأبي عیسیٰ**'' اور باب کے تحت کی روایت سے کراہت ثابت ہے لیکن اس کے برخلاف امام ابوداؤدؒ نے ''کتاب الأدب'' میں اس کا جواز ثابت کیا ہے ''**باب ما یتکنی بأبي عیسیٰ**'' اس لئے علماء نے جن روایتوں سے کراہت ثابت کی ہے ان سب کا جواب دیا ہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ | ترمذی کے نام سے ائمہ میں تین حضرات مشہور ہیں اس لئے اکثر لوگوں کو مغالطہ ہو جایا کرتا ہے، حالانکہ تینوں کے درجات مختلف ہیں۔

(۱) امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ صاحب ''سنن'' ہیں۔

(۲) ابوالحسن احمد بن حسن ہیں، یہ ترمذی کبیر کے لقب سے مشہور ہیں اور امام احمدؒ کے تلامذہ میں سے ہیں، نیز امام ترمذیؒ صاحب ''سنن'' وامام بخاری وابن ماجہؒ کے شیوخ میں ہیں۔

(۳) حکیم ترمذی صاحبِ ''نوادر الأصول'' ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ''بستان'' میں فرماتے ہیں کہ'' نوادر'' کی اکثر روایات ضعاف اور غیر معتبر ہیں[۱]۔

تصانیف | امام ترمذیؒ نے بکثرت تصانیف کی ہیں، آپ کو فقہ اور تفسیر پر بھی کافی دستگاہ

---

[۱] بستان المحدثین ص ۱۲۰

حاصل تھی جوان کی ''سنن'' سے ظاہر ہے، ان کی مختلف کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔
① العلل الصغیر [۱] ② العلل الکبیر [۲] ③ التاریخ ④ الزہد ⑤ الشمائل [۳] ⑥ الأسماء والکنی ⑦ اسماء الصحابۃ ⑧ جامع الترمذی [۴]۔

جامع الترمذی حدیث کی جس کتاب میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کئے جائیں اس کو ''جامع'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور وہ آٹھ قسم کے مضامینِ جامع یہ ہیں:
① سیر و ② آداب و ③ تفسیر و ④ عقائد ⑤ فتن و ⑥ احکام و ⑦ اشراط و ⑧ مناقب۔

چونکہ ''ترمذی'' ان آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل ہے اس لئے اس کو ''جامع'' کہا جاتا ہے اور چونکہ ترتیب فقہی کے اعتبار سے بکثرت احکام کی حدیثیں لائے ہیں اس لئے ''سنن'' کا بھی اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ پہلے کتاب الطہارۃ لائے ہیں اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ پھر زکوٰۃ وصوم وغیرہ۔

---

[۱] یہ کتاب امام ترمذی نے ''سنن'' کی تالیف کے بعد مستقل تالیف کی اور اخیر میں اس کا اضافہ کیا جیسا کہ ابن نقطہ نے اپنی کتاب ''التقیید'' (۱/۹۵) میں اس کی وضاحت کی ہے۔

[۲] شمائل میں مصنف نے چار سو (۴۰۰) احادیث جمع کی ہیں اور چھپن (۵۶) بابوں پر منقسم ہیں، اس کی مختلف لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں، [۱] ''جمع الوسائل'' لملاعلی القاری، [۲] ''شرح الشمائل'' للإمام المناوی، شیخ ابراہیم باجوری کا حاشیہ اور مولانا احمد علی صاحبؒ کا حاشیہ زیادہ مقبول ہیں اور ان سب شروح اور دیگر کتب احادیث کی شروح کا خلاصہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے شمائل کے ترجمہ ''خصائل نبوی'' کے حاشیہ پر جمع کر دیا ہے۔

[۳] اس کتاب کو قاضی ابوطالب نے ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔

[۴] تدریب (ص ۲۶۰)

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ حاکم وخطیب نے بھی اسے ''الجامع'' کہا ہے مگر ترمذی کو حاکم کا صحیح کہنا اور نسائی وترمذیؒ کو خطیب کا صحیح کہنا فی الواقع ان کے نزدیک تساہل ہے [1]۔

لیکن فی الواقع اس کو تساہل قرار دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ باعتبار اغلب کے صحیح کہا جاسکتا ہے جیسے صحاح ستہ کہنا باعتبار اغلبیت کے ہے، نیز امام ترمذیؒ خود بھی اس کو صحیح فرماتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں: **صنّفت هذا ''المسند الصحيح'' (و كذا قال ابن كثير في تاريخه).**

سنن ترمذی کے محاسن وفضائل امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے علمائے حجاز کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو بہت پسند فرمایا اور علمائے خراسان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بھی دادِ تحسین دی، پس جس گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس میں نبی کریم ﷺ گفتگو فرمارہے ہیں [2]۔

شیخ ابراہیم باجوری کا یہ مشورہ ہر طالب حدیث کے لئے ہے کہ ''الجامع الصحیح'' کا مطالعہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ کتاب حدیثی وفقہی فوائد اور سلف وخلف کے مذاہب کی جامع ہے پس یہ مجتہد کے لئے کافی ہے اور مقلّد کے لئے بے نیاز کرنے والی ہے، میرے خیال میں مجتہد کے لئے تو کافی ہوسکتی ہے لیکن مقلد کے لئے کافی نہیں [3]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:

ترمذی کی ''جامع'' ان کی کتابوں میں سب سے بہتر تصنیف ہے بلکہ متعدد وجوہ سے جمیع کتب حدیث سے احسن ہے۔

---

[1] تدریب ص۵۴ [2] تذکرہ ج۲ ص۲۰۸ [3] مقدمۂ الکوکب الدری ص۲۱

① اس میں حسن ترتیب اور عدم تکرار ہے۔
② فقہاء کے مذاہب کا ذکر ہے، نیز ہر مذہب والوں کے وجوہ استدلال بھی ہیں۔
③ حدیث کے انواع صحیح وحسن، ضعیف، غریب، معلل وغیرہ بھی بیان کئے ہیں۔
④ اسی طرح راویوں کے اَسماء واَلقاب اور ان کی کنیتیں، نیز دیگر فوائد جو علم رجال سے متعلق ہیں ان پر بھی خاصی گفتگو ہے [۱]۔

شیخ ابن صلاح کا فیصلہ ہے: **كتاب أبي عيسىٰ أصل في معرفة الحسن** [۲].

حافظ محمد بن طاہر مقدسی نے ذکر کیا کہ امام ابواسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری کے سامنے ہرات میں امام ترمذیؒ اور ان کی کتاب کا ذکر آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کی کتاب میرے نزدیک ''بخاری'' و''مسلم'' سے زیادہ انفع ہے، کیونکہ ''بخاری'' و''مسلم'' سے فائدہ صرف عالم متبحر ہی اٹھا سکتا ہے اور ابوعیسیٰ کی کتاب سے ہر شخص مستفید ہوسکتا ہے۔

ترمذی کی غرض | ہر محدث نے جمع حدیث کے لئے اپنی کتاب میں کچھ خاص چیزیں بطور غرض ومقصد کے پیشِ نظر رکھی ہیں، امام ترمذی کا مقصودِ اعظم بیانِ مذاہب ہے مع الاستدلال، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا:

> ''ابوعیسیٰ ترمذیؒ نے گویا شیخین کے طریقے کو جو ابہام وتبیین کا راستہ تھا اور ابوداوٗدؒ کی راہ جو فقہاء کے مستدلات کا بیان تھا، اس کو نہایت عمدگی سے جمع کر کے پیش کیا بلکہ دونوں راستوں کو جمع کر دیا ہے اور مزید برآں صحابہؓ وتابعین وفقہاء کے مذاہب کا اضافہ بھی کر دیا

---

[۱] بستان ص۱۲۰ [۲] تدریب ص۵۵

گیا ہے، حقیقت میں انہوں نے بہت ہی جامع کتاب لکھی ہے، اسی طرح حدیث کے طرق کو بھی نہایت لطیف طریقہ سے مختصر کیا ہے پس ایک حدیث کو ذکر کر دیا اور اسی باب میں اس کے ماسوا کی طرف اشارہ کر دیا اور ہر حدیث کی حیثیت بیان کر دی کہ آیا صحیح ہے یا حسن ہے، ضعیف ہے یا منکر اور حدیث کے ضعف کو بھی بیان کیا تا کہ طالبِ حدیث کو بصیرت حاصل ہو جائے، قابلِ عمل اور نا قابلِ عمل میں امتیاز ہو جائے، پھر حدیث کا مستفیض وغریب ہونا بھی بیان کیا، پھر صحابہؓ و فقہائے امصار کے مذاہب بھی بیان کئے'' [۱]۔

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کا مقصودِ اعظم بیانِ مذاہب ہے، امام ترمذیؒ کا صحابہؓ وتابعین کے مذاہب کو بیان کرنا احکام کی بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، اسی طرح امام موصوف نے ان مذاہب کو بھی بیان کیا جو کہ متروک ہو چکے ہیں، جیسے امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کے مذاہب جس سے ترمذیؒ کے واسطہ کے بغیر واقفیت ناممکن ہے [۲]۔

ترمذی کا مسلک | حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ کشمیریؒ) نے شافعی کہا ہے [۳]، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ امام ترمذیؒ امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اس لئے ان پر بھی مجتہدانہ رنگ غالب ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **و كان أهل الحديث قد ينسب إلىٰ أحد المذاهب لكثرة موافقته** [۴]۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۲۱ [۲] از افادات مولانا بنوریؒ [۳] عرف الشذی ج ا ص ۳۳
[۴] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۲۲

یعنی محدثین کا کسی امام کی کثرتِ موافقت کی وجہ سے اسی مذہب کی طرف انتساب کیا جاتا ہے، مطلب یہ کہ انہوں نے ان کے اصول کے مطابق اجتہاد و استخراج مسائل کیا ہو اگر کوئی جزئی اختلاف ہو جائے تو ایسا ممکن ہے اور اس طرح کا اختلاف مسلک شافعی میں داخل ہونے کے لئے قادح نہیں [1]، چنانچہ امام ترمذیؒ نے بھی امام شافعی سے بعض مسائل میں اختلاف کیا جیسے ''**باب تأخير الظهر في شدة الحرّ**''، اس طرح کی مخالفت ان کے مذہب شافعی کی طرف منسوب کرنے میں قادح نہیں، جب کہ اکثر مسائل میں ان کے مقلد ہیں، لیکن بعض حضرات نے امام ترمذیؒ کی خاص اصطلاح ''**عند أصحابنا**'' سے استدلال کیا ہے کہ وہ مجتہد مطلق تھے اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ امام فرماتے ہیں: ''**و العمل على هذا عند أصحابنا و عند الشافعي و أحمد و إسحق**''.

اسی طرح ''باب العاقلۃ'' میں فرمایا: ''**هو قول الشافعي و أصحابنا**''، اس سے ثابت ہوا کہ وہ حنبلی و شافعی نہیں تھے، لیکن اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس سے محدثین ہی کی ایک جماعت مراد ہے، چنانچہ شیخ سراج اور علامہ سندھی دونوں نے محدثین ہی کی جماعت مراد لیا ہے، تو اوپر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مقولہ گزر چکا ہے کہ محدثین کی جماعت کا کسی نہ کسی امام کی طرف انتساب تھا، اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کا مسلک ''شافعی'' کی طرف انتساب کرنا درست ہے۔

امام ترمذیؒ کی جرح وتعدیل کی حیثیت | آپؒ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ روایت پر پوری طرح جرح وتعدیل سے کام لیتے ہیں، کیونکہ اس فن میں انھیں رسوخ

---

[1] مقدمۂ لامع ص ۲۴

حاصل تھا، جیسا کہ ان کی کتاب ''السنن'' اور ''کتاب العلل'' کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے، لیکن روایت کی تحسین وتصحیح میں بعض جگہ ان سے تساہل واقع ہوا ہے۔

ملاّ علی قاریؒ نے کہا: ''**عنده نوع من التساهل في التصحيح لا يضرّه** ۱؎'' (امام ترمذیؒ تصحیح روایت میں تساہل واقع ہوئے ہیں لیکن فی الواقع یہ کچھ نقصان دہ نہیں) آگے چل کر ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں **و أطلق الحاكم و الخطيب الصحة علىٰ ما جمع في سنن الترمذي**'' ، لیکن علامہ سیوطی نے حاکم اور خطیب کے فیصلہ کو بھی تساہل قرار دیا ہے۔

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

''ترمذی'' کا درجہ ''ابوداوٗد'' اور ''نسائی'' کے بعد رکھا جائے گا، اس لئے کہ انہوں نے مصلوب وکلبی جیسے لوگوں کی روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے'' ۲؎۔

اسی طرح علامہ موصوف نے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی کے ترجمہ میں لکھا ہے ۳؎:

'' **قال ابن معين : ليس بشيءٍ، و قال الشافعي وأبوداود : ركن من أركان الكذب، و ضرب أحمد علىٰ حديثه إلخ** ''.

اس کے باوجود امام ترمذیؒ نے اس کی حدیث کی تخریج کی ہے وہ حدیث یہ ہے: ''**الصلح جائز بين المسلمين**'' اور اس کی تصحیح کی ہے، لہذا علماء ترمذی کی

۱؎ مرقاۃ ج۱ ص۲۱ ۲؎ تدریب ص۵۶ ۳؎ میزان الاعتدال ج۳ ص۴۰۷

تصحیح پر اعتماد نہیں کرتے، نیز اسی طرح یحیٰ بن یمان کے ترجمہ میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے حالانکہ اس میں تین رواۃ ضعیف ہیں، وہ حدیث یہ ہے:

''إن النبي ﷺ دخل قبراً ليلاً، فأسرج له سراج''.

اس روایت کے ذیل میں علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

''امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کر کے اس کو حدیث حسن کہا ہے حالانکہ ان کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس حدیث کا مدار حجاج بن اَرطاۃ پر ہے اور یہ مدلّس ہے، اس نے سماع کا کہیں ذکر نہیں کیا'' [1]۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن قطان فرماتے ہیں کہ اس کے ایک راوی منہال بن خلیفہ کی ابن معین نے تضعیف کی ہے اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں '' فيه نظر '' [2]۔

اس سے ثابت ہوا کہ امام موصوف نقد روایت میں متساہل واقع ہوئے ہیں، بہرحال ان کے فیصلہ پر تحقیق و جستجو کے بعد ہی عمل کیا جائے گا، لیکن ان کا تساہل حاکم کے تساہل سے مختلف ہے۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:'' قيل: إن تصحيحه (الحاكم) دون تصحيح الترمذي و الدار قطني بل تصحيحه كتحسين الترمذي و أحيانا يكون دونه''، یعنی حاکم کی تصحیح ترمذی ودارقطنی کی تصحیح سے کم حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ ترمذی کے تحسین کے درجہ پر رکھی جا سکتی ہے اور کبھی اس سے بھی کم حیثیت دی

---

[1] نصب الرایہ ج۲ص۳۰۰ [2] نصب الرایہ ج۲ص۳۰۰

جائے گی[۱]۔

علامہ ابن حزم کی تنقید کا جواب امام موصوف کی ثقاہت وجلالتِ شان کے باوجود بھی بعض محدثین نے ان پر تنقید کی ہے جس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز علامہ ابن حزم کی تنقید ہے اور کہہ دیا کہ ''ترمذی مجہول ہیں'' جس کو جمہور محدثین نے رد کر دیا ہے، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ: ''ابوعیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے ان کے بارے میں ابن حزم کا یہ قول کہ ''وہ مجہول'' ہیں نا قابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان کی کتاب ''جامع''، ''علل'' سے واقف ہی نہ تھے[۲]۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''ابن حزم نے کتاب الفرائض من ''الإیصال''[۵] میں محمد بن عیسیٰ کو مجہول لکھا ہے، لیکن یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر نہ ہو، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور ثقات کے متعلق لکھے ہیں، حالانکہ وہ ساری مخلوق میں مسلّم اور مشہور ہیں''[۳]۔

علامہ ذہبی نے ''سیر أعلام النبلاء'' میں نہایت عمدہ بات لکھ دی ہے کہ ابن حزم نے بہت سی کتبِ احادیث کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ''سنن نسائی'' اور ''ابن ماجہ'' اور ''جامع ترمذی'' کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے، کیونکہ یہ کتابیں انہوں نے دیکھی ہی نہ تھیں، ان کی وفات کے بعد ''اندلس'' میں داخل ہوئیں، اسی طرح حافظ بیہقی کے پاس بھی یہ کتابیں موجود نہ تھیں[۴]۔

---

[۱] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۱ [۲] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۷۸

[۳] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸ [۵] فی التہذیب ''الاتصال''، وھو تصحیف [۴] ماتمس إلیہ الحاجہ ص ۲۵

ملا علی قاریؒ کا تسامح "سنن ترمذی" میں ایک سو اکیاون (۱۵۱) عنوان کتب ہیں اور ہر کتاب کے تحت سینکڑوں ابواب ہیں اور اس کتاب میں ایک روایت ثلاثی بھی ہے" ۱؎۔

لیکن ملا علی قاریؒ سے یہاں تسامح ہو گیا، مرقاۃ جلد اول صفحہ ۲۱ پر رقم طراز ہیں:

"جامع ترمذی" کو صحاح کے درمیان ایک خصوصیت یہ حاصل ہے کہ اس کی ایک حدیث ثنائی ہے اور وہ یہ ہے"۔

"يأتي على الناس زمان ، الصابر فيه علىٰ دينه كالقابض على الجمر"، فإسناده أقرب من إسناد البخاري و مسلم و أبي داود فإن لهم ثلاثيات ۲؎.

امام ترمذی نے اس کو "کتاب الفتن" میں روایت کیا ہے، پوری اسناد یوں ہے:

"حدثنا إسمعيل بن موسىٰ الفزاري ابن بنت السدي الكوفي، ناعمر بن شاكر عن أنس بن مالكؓ قال: قال رسول اللهﷺ إلخ "۳؎ .

اس میں حضور ﷺ تک تین واسطے ہیں، اسماعیل بن موسیٰ، عمر بن شاکر اور انس بن مالک پس اس کی سند ثلاثی ہے نہ کہ ثنائی۔

جامع صحیح کی معمول بہا احادیث امام ترمذیؒ نے "کتاب العلل" جلد ۲ ص ۲۴۶ پر یہ دعویٰ کیا ہے:

۱؎ دیکھئے: "مقدمۂ الکوکب الدری" ج ۱ ص ۲۶ ۲؎ مرقاۃ ج ۱ ص ۲۱

۳؎ "جامع الترمذی" کتاب الفتن (۲۶۲/۴، رقم ۲۲۶۰)

''میری اس کتاب کی ساری احادیث معمول بہا ہیں اور ہر
ایک پراہل علم میں سے کسی نہ کسی کا عمل ضرور ہے سوائے دو کے''۔

(۱) **حدیث ابن عباس: أن النبي ﷺ و سلم جمع بين الظهر و العصر بالمدينة، و المغرب و العشاء من غير خوفٍ و لا مطرٍ و لا سفرٍ''.**

(۲) دوسری حدیث: **عن النبي ﷺ عليه و سلم أنه قال: ''من شرب الخمر فاجلدوه، فإن عاد في الرابعة فاقتلوه''.**

لیکن فی الواقع ان دونوں حدیثوں پر بھی بعض اہل علم کا عمل ہے، حنفیہ حدیث اول کو جمع صوری، اور حدیث ثانی کو سیاست پر محمول کرتے ہیں، اگر امیر المؤمنین مصلحت سمجھے تو چوتھی بار قتل بھی کرسکتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ احناف کے یہاں ان دونوں پر عمل کیا جاسکتا ہے، مزید تفصیل کے لئے ''شرح مسلم'' از امام نووی (جلد ۵ ص ۲۱۸، ۲۱۹) کو دیکھا جائے۔

جامع ترمذی کی بعض کتابی خصوصیات | تمام محدثین کی کتابوں میں کچھ علیحدہ علیحدہ خصوصیتیں موجود ہیں، ''صحاح ستہ'' کے مصنفین میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ یہ کوشش کی ہے کہ ''اس کی کتاب میں کوئی نئی اور مفید بات موجود ہو جو کہ اسے دیگر کتب سے ممتاز کرسکے''۔

اس کی تفصیل ہر ایک کے حالات کے ساتھ کی جائے گی، فی الحال ہمارے پیشِ نظر امام ترمذی کی ''سنن'' کی خصوصیات بیان کرنا ہے جس کا جاننا ایک طالبِ علم کے لئے از حد ضروری ہے:

(۱) کبھی امام ترمذیؒ ترجمۃ الباب کسی صحابی کی مشہور حدیث سے منعقد کرتے

ہیں جس کی سند ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور اس حدیث کی ''صحاحِ ستہ'' کے مؤلفین نے بھی تخریج کی ہوتی ہے لیکن اس ترجمہ کے تحت اس حکم کو دوسرے صحابی کی حدیث غیر معروف سے ثابت کرتے ہیں اگرچہ اس کی اسناد حدیث منعقد ترجمہ سے کم درجہ کی ہوتی ہے، لیکن اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں **في الباب عن فلان و فلان إلخ** اور پوری ایک جماعت کا تذکرہ کر دیتے ہیں، جس میں اس صحابی کا بھی نام لے لیتے ہیں جس کی حدیث سے ترجمہ منعقد کیا تھا، اس کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث غیر مشہور سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے اور اگر اس میں کوئی علّتِ خفیہ ہے تو اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، اسی طرح متن کی کمی و زیادتی کو بھی بیان کر دیتے ہیں [۱]۔

(۲) ان کی عادت یہ ہے کہ **في الباب عن فلان و فلان** کہتے ہیں یعنی بہت سے صحابہ کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی **عن فلان عن أبيه** کہتے ہیں اور اس میں متعدد باتیں ان کے پیشِ نظر ہوتی ہیں، کبھی تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان صحابی کے صرف بیٹے ہی نے ان سے روایت کی ہے اور کبھی صحابی کے نام میں اختلاف ہوتا ہے تو بیٹے کا نام التباس دور کرنے کے لئے بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ صحابی کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے بھی ایسا کر دیتے ہیں۔

(۳) عام طور پر جس صحابی کی روایت باب کے تحت لاتے ہیں پھر فی الباب میں اس کا تذکرہ نہیں کرتے، مثلاً باب کے تحت اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث لائے تو **في الباب عن أبي هريرة** نہیں کہیں گے البتہ چند جگہیں مستثنیٰ ہیں مثلاً ''**باب الركعتين: إذا جاء الرجل و الإمام يخطب**'' اس باب میں حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے

---

[۱] نفع قوت المغتذی ج۱ ص۸

اوردوبارہ پھر **في الباب عن جابر** کہا ہے، حافظ عراقی فرماتے ہیں، ممکن ہے حضرت جابرؓ کی دوسری روایت کی طرف اس باب میں اشارہ کررہے ہوں۔

(۴) اسی طرح حدیث طویل کو مختصر کر کے آخر میں فرماتے ہیں **فيه قصة أو فيه كلام أكثر من هذا.**

(۵) اسمائے مشترکہ کے درمیان تمیز کرتے ہیں جیسے یزید الفارسی و یزید الرقاشی اسی طرح ان کنیتوں کے درمیان جن میں اشتراک ہوتا ہے اس کے فرق کو بھی ترمذی واضح کردیتے ہیں جیسے **أبو حازم الزاهد ، أبو حازم الأشجعي** پہلے کا نام سلمہ ابن دینار مدینی اور دوسرے کا نام سلمان کوفی ہے، مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی طرح کا غموض وخفا ہوتا ہے وہاں لازمی طور پر اس کو واضح کردیتے ہیں۔

(۶) اسی طرح سے باب بلاترجمہ کے لاتے ہیں اور اس میں کسی حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں **في الباب عن فلان** اس کے ذریعہ سے اس مضمون کی دوسری روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، نیز باب بلاترجمہ سے کسی ایسے مسئلہ کی طرف تنبیہ کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق ماقبل کے ترجمۃ الباب سے ہے جیسا کہ ان کے شیخ امام بخاری کا طرز عمل اور طریقۂ کار ہے۔

(۷) اسی طریقے سے ترجمہ کے تحت حدیث لانے کے بعد کہتے ہیں **في الباب عن فلان** یعنی کسی دوسرے صحابی کا یہاں ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد اسی صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں جس کی حدیث کی طرف **في الباب** میں اشارہ کیا گیا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابی کی یہی حدیث مراد ہے جس کو بعد میں ان سے روایت کررہے ہیں مثلاً ''**باب زكوٰة البقر**''، میں حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کے

بعدفرماتے ہیں و في البـاب عن معاذ بن جبل اورپھراس کے بعدحضرت معاذؓ سےتقریباًاسی مضمون کی روایت نقل کی ہے جوابن مسعودؓ کی روایت میں تھا۔

(۸) اسی طرح ترجمہ کےتحت میں کبھی دومرتبہ و في البـاب عـن فلان کہتے ہیں جیسے''بـاب أكل لحوم الجلّالة'' میں پہلےابن عمرؓ کی روایت کولے آئے ہیں اورپھرکہا و فـي البـاب عن ابن عبـاس اورابن عباسؓ کی پوری روایت نقل کردی ہےاوراس کی تصحیح وتحسین کے بعدفرماتے ہیںو في الباب عن ابن عمرؓ اورروایت نہیں نقل کی بظاہر دوبارہ فی الباب کہنے سےان کی غرض یہ ہے کہ حدیث اول کے ہم معنیٰ ابن عمرؓ سےدوسری روایت بھی موجود ہے كما في أبي داود وغیرہ۔

(۹) عام طور پر اکثر ابواب میں خصوصاً احکام کی حدیث میں ایک ہی حدیث کے درج کرنے پراکتفاء کیا ہےاوراس حدیث کے دیگرطرق یااس باب کی دیگرروایات کی طرف اشارہ کردیا ہے،اس لئے احکام کی احادیث کی تعدادان کی کتاب میں بہت کم ہے لیکن اس کا تدارک فی الباب عن فلاں کے ذریعہ کردیتے ہیں، یہ ترمذی کی ایسی خصوصیت ہے جس کی محدثین کی نظر میں بہت اہمیت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ اس حدیث یااس مضمون کےروایت کرنے والےصحابہؓ کی تعدادمعلوم ہو جاتی ہےاوراس میں ایسااستیعاب کیا ہےجس کی تخریج کے لئے ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہوں گے، حافظ ابن حجرؒ کی اس میں مستقل تصنیف ہے''اللبـاب فيـمـا يقول الترمذي في البـــــاب'' جومدینہ منورہ کےکتب خانہ میں موجود ہے،اس میں مصنف نےتخریج روایات کے علاوہ پوری طرح جرح وتعدیل سے کام لیا ہے، فی الباب سےبعض لوگوں کوغلط فہمی ہوجاتی ہے کہ امام ترمذیؒ نے جن رواۃ کےاسماء کی طرف اشارہ کیا ہے

وہ لوگ بعینہ اسی متن کو روایت کر رہے ہیں۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ حدیث معین مراد نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہم معنی دیگر روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، چنانچہ علامہ عراقی کا کہنا ہے کہ کبھی وہی حدیث معین ہی مراد ہوتی ہے اور کبھی اس مضمون کی دیگر روایات کی طرف اشارہ ہوتا ہے [۱]۔

(۱۰) کبھی ترجمہ کے تحت احادیث غریبہ کو لاتے ہیں اور اسی باب کی دیگر روایات صحیحہ کی طرف في الباب سے اشارہ کر دیتے ہیں، اگرچہ امام ترمذی کی تخریج روایت کی شرطیں شیخین وابوداود اور نسائی سے کم درجہ رکھتی ہیں، لیکن صحت وضعف اور علل حدیث پر بھی تنبیہ کر کے اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔

حافظ ابن رجب حنبلی نے ''شرح علل الترمذي'' میں تحریر فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں حدیث صحیح وحسن اور غریب کو بیان کیا ہے جس میں بعض مناکیر بھی ہیں، خصوصاً فضائل میں، لیکن ساتھ ہی اس کی صحت وضعف کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں، لیکن علامہ حازمیؒ فرماتے ہیں اگر حدیث، ضعیف یا طبقۂ رابعہ کی ہوتی ہے تو اس کے ضعف پر تنبیہ کر دیتے ہیں، اور اس صورت میں یہ روایت ان روایات صحیحہ فی الباب کے لئے بمنزلہ شاہد ومتابع کے بن جاتی ہے اور امام ترمذیؒ کا اعتماد حقیقت میں وہی روایاتِ صحیحہ ہی ہوتی ہیں، جو جمہور کے نزدیک بھی صحیح ہیں [۲]۔

(۱۱) امام ترمذیؒ کی عادت ہے کہ عام طور پر دو طرح کے تراجم قائم فرماتے ہیں، ایک ترجمہ سے اہل حجاز جس میں عام طور پر امام شافعیؒ وامام مالکؒ ہوتے ہیں، ان کے

---

[۱] تدریب ص۸۳ [۲] شروط الائمہ ص۴۴

مسلک کی تائید مقصود ہوتی ہے، اور دوسرے ترجمہ سے اہل عراق جس میں عام طور پر امام ابوحنیفہؒ ہوتے ہیں، اس سے ان کے مسلک کی تائید فرماتے ہیں ۱؎۔

(۱۲) امام ترمذیؒ حدیث کی صحت اور حسن کا فیصلہ صادر کرنے کے بعد فرماتے ہیں" **والعمل علیٰ هذا عند أهل العلم أو أكثر أهل العلم أو عند بعض أهل العلم**" اس کے ذریعہ سے فقہاء کے مذاہب کا علم ہوجاتا ہے، اور بعض ایسے فقہاء کا مسلک معلوم ہوتا ہے جس سے واقفیت امام ترمذیؒ کے واسطہ کے بغیر مشکل ہے۔

(۱۳) اسی طرح امام ترمذیؒ جب کسی حدیث کو حسن یا غریب کہتے ہیں تو عام طور پر ان دونوں میں سے جو وصف غالب ہوتا ہے اس کو مقدم کرتے ہیں جیسے " **باب ما جاء في الأربع قبل العصر**" ۲؎، اس باب کے تحت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت "**رحم الله امرأً صلّى أربعاً**" إلخ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: **هذا حديث حسنٌ غريبٌ**، علامہ عراقی کی رائے ہے کہ حسن و غرابت میں جو وصف غالب ہوتا ہے اس کو مقدم فرماتے ہیں، پس ابن عمرؓ کی یہ حدیث صرف ایک ہی سند سے مروی ہے لیکن حسن کا وصف غالب ہے اسی ضابطہ کو مصنف نے یہاں بھی ملحوظ رکھا ہے ۳؎۔

امام ترمذیؒ کی بعض مشہور اصطلاحات امام ترمذی نے اپنی کتاب میں بعض ایسی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے جن کا تعلق عام طور پر جرح و تعدیل یا بیان مذاہب وغیرہ سے ہے، ہم ان میں سے صرف چند کو بیان کریں گے جن کی کتاب میں زیادہ اہمیت ہے، چنانچہ امام موصوفؒ بکثرت فرماتے ہیں" **هذا حديثٌ حسنٌ**

۱؎ معارف السنن ج۱ ص۸۸ ۲؎ جامع الترمذی ج۱ ص۵۷ ۳؎ تدریب ص۵۵

صحیحٌ‘‘اور کبھی ’’حسنٌ صحیحٌ‘‘ کہتے ہیں،اور کبھی ’’ھذا حدیث حسنٌ صحیحٌ غریبٌ‘‘ فرماتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ان تینوں اوصاف یا ان میں سے دو کا اجتماع نہیں ہوسکتا، اور فی الواقع یہ اشکال اس وقت پیدا ہوگا جب حدیث کی مشہور اصطلاحی تعریف مراد لی جائے، لیکن امام ترمذیؒ خود مجتہد ہیں، چنانچہ حدیث حسن کی تعریف جمہور کے خلاف یوں کی ہے کہ ’’حسن وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی متہم نہ ہو، وہ روایت شاذ نہ ہو اور متعدد طرق سے مروی ہو‘‘ [۱]، لیکن علامہ سیوطیؒ نے ابن سید الناس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے حسن کی محض ایک قسم کی تعریف کی ہے اور اس کی صراحت امام موصوف نے ’’کتاب العلل‘‘ میں کر دی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ یہ امام ترمذیؒ کی خاص اصطلاح ہے [۲]۔

بہر کیف جمہور کے قول کے مطابق بھی حسن وصحیح کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ایک حدیث ایک محدث کی تحقیق میں صحیح ہے اور دوسرے کے نزدیک حسن ہے یا اس کے برعکس، اسی طریقے سے ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ ہے اور دوسرے کے نزدیک حسن لغیرہ ہے، یا ایک حدیث دو اسانید سے مروی ہے، ایک کے اعتبار سے حسن اور دوسرے کے اعتبار سے صحیح ہو [۳]۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، عموماً ایک حدیث کی سند میں مجتہد کو تردد ہوتا ہے کہ آیا راوی میں شرائط حسن کے ہیں یا صحیح کے ہیں، پس مجتہد نے دونوں کو بیان کر دیا اور کثرتِ استعمال کی وجہ سے ’’أو‘‘ گر گیا، اور اصل عبارت یوں ہوگی، حدیثٌ حسنٌ أو صحیحٌ [۴]، نیز اس کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں، بعض لوگوں نے

---

[۱] کتاب العلل الصغیر ص ۲۴۰ — [۲] تدریب الراوی ص ۵۱
[۳] مقدمۂ اصول حدیث از شیخ عبدالحقؒ — [۴] شرح نخبۃ الفکر ص ۲۴

حسن وصحیح کے لغوی معنی مراد لئے ہیں لیکن یہ دونوں باتیں امام ترمذیؒ کی شان سے بعید ہیں [۱]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح حسن وصحیح کے اجتماع میں کوئی دشواری نہیں، اسی طرح غریب وحسن کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ امام ترمذیؒ نے حسن کی تعریف میں تعدد طرق کا لحاظ کیا ہے جو ان کی اپنی اصطلاح ہے، پس جہاں وہ ''حسنٌ غریبٌ'' کہتے ہیں وہاں ان کی خاص تعریف مراد ہوتی ہے [۲]۔

لفظ کراھیۃ وکراھۃ کا مطلب امام ترمذیؒ کے چند مخصوص الفاظ ہیں ان دونوں کو بکثرت استعمال فرماتے ہیں، چنانچہ ''**باب کراھیۃ الاستنجاء بالیمین**''، ''**باب في کراھیۃ الصلوٰۃ بعد العصر و بعد المغرب**'' عام طور پر کراہۃ سے مکروہ تنزیہی وخلاف اولیٰ ہی مراد لیا جاتا ہے، لیکن امام ترمذیؒ نے کبھی اس سے ایک عام معنی مراد لئے ہیں جو تحریمی وتنزیہی دونوں کو شامل ہیں، جیسے ترجمہ ہے ''**باب ماجاء في کراھیۃ الإقعاء بین السجدتین**''، یہاں اقعاء کی دونوں صورتوں کو مراد لیا ہے، حالانکہ اِقعاء کی ایک صورت تحریمی کی ہے اور دوسری تنزیہی کی ہے اور کبھی کراہت سے کراہت تحریمی ہی مراد لی ہے جیسے ''**باب ما جاء في کراھیۃ أن یبادر الإمام في الرکوع و السجود**'' امام سے مسابقت بالاتفاق حرام ہے اور کبھی کراہت تنزیہی کو مراد لیا ہے، جیسے ''**باب الأذان بغیر أجر**'' یہاں کراہت تنزیہی مراد ہے۔

---

[۱] الکوکب الدری ج۱ص۱۱ [۲] مقدمۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کیونکہ ان دونوں میں تفریق سلف کے نزدیک نہیں تھی اور عام طور پر لفظ کراہت سے مکروہ تحریمی ہی مراد لیا کرتے تھے، علامہ عینی فرماتے ہیں " **المتقدمون يطلقون الكراهة و يريدون كراهة التحريم** " [1]۔

البتہ دونوں میں تفریق متأخرین فقہاء نے عوام کی سہولت کے پیش نظر قائم کی ہے، علامہ ابن قیمؒ نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں: متأخرین نے مکروہ تنزیہی و خلافِ اولیٰ کی اصطلاح ایجاد کی ہے اور اب لفظ کراہت سے تنزیہی کے معنی مراد لئے جاتے ہیں [2]۔

بعض اہلِ کوفہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ امام ترمذیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک صراحت کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا حالانکہ جہاں اہل کوفہ کا مسلک نقل کرتے ہیں ان کے ساتھ اکثر حنفیہ ہی کو مراد لیا ہے، اس لئے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مصنف نے جہاں کہیں لفظِ اہل کوفہ لکھا ہے اس سے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ مراد ہیں، شیخ سراج لکھتے ہیں کہ جہاں کہیں امام موصوف نے اہل کوفہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے مراد امام ابوحنیفہؒ ہیں اور ایسا امام صاحبؒ کی شان میں غایتِ تعصّب سے کیا ہے [3]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ کو ائمہ مجتہدین کے ساتھ ایک طرح کا تعصّب تھا، خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ذات گرامی سے، اس لئے انہوں نے امام صاحبؒ اور ان کے تلامذہ کی طرف بعض اہل کوفہ سے اشارہ کیا ہے، اور امام صاحبؒ کے اسم شریف کو کہیں کتاب میں صراحۃً ذکر نہیں کیا ہے [4]۔

---

[1] عمدۃ القاری ج۳ ص ۳۸۷
[2] مقدمہ تحفۃ الأحوذی ص ۲۰۵
[3] شرح جامع الترمذی ص ۶۱
[4] ما تمس بہ الحاجۃ ص ۱۱۰

ان حضرات کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل کوفہ سے حنفیہ ہی مراد ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں، کبھی اس کا اطلاق دوسرے علمائے کوفہ پر بھی کیا ہے [۱]، جیسے "باب ما جاء أنه يبدأ بمؤخرا الرأس"، اس ترجمہ کے تحت فرماتے ہیں قد ذهب أهل الكوفة إلىٰ هذا الحديث منهم و كيع بن الجراح.

حضرت مولانا انور شاہؒ فرماتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ترمذیؒ کو امام صاحبؒ کا مسلک کسی قابل اعتماد سند سے نہیں پہونچا تھا، جیسا کہ زعفرانیؒ کے واسطے سے امام شافعیؒ کا قول قدیم پہونچا، مزید برآں یہ اپنے شیخ امام بخاریؒ کی شخصیت سے متأثر تھے [۲]۔

لیکن امام ترمذیؒ نے ایک روایت امام صاحبؒ سے "کتاب العلل" [۳] میں نقل کی ہے جو مصری نسخہ میں موجود ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے "تہذیب التہذیب" میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور وہ روایت یہ ہے "حدثنا محمود بن غيلان حدثنا أبو يحيى الحمّاني قال: سمعت أبا حنيفة يقول: ما رأيت أكذب من جابر الجعفي، ولا أفضل من عطاء بن أبي رباح".

نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کو امام ترمذیؒ ائمۂ جرح وتعدیل میں سمجھتے ہیں [۴]۔

جامع ترمذی پر علامہ ابن جوزیؒ کی تنقید علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے "جامع ترمذی" کی تیس احادیث کو موضوع قرار دیا ہے [۵]، لیکن علامہ ابن

---

[۱] کوکب ص ۳۴۷ [۲] أعلام المحدثین ص ۲۴۶ [۳] جامع الترمذی کتاب العلل ج ۵ ص ۵۴۸
[۴] کوکب ج ۲ ص ۳۴۷ [۵] مقدمۂ لامع ص ۶۳

جوزیؒ نقد روایات میں متشدد قرار دیئے گئے ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب میں بہت سی ایسی احادیث کو موضوع کہہ دیا ہے جن کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ضعیف ہیں، علامہ ذہبیؒ کی رائے ہے کہ ابن جوزیؒ نے بہت سی قوی وحسن روایات کو بھی کتاب ''الموضوعات'' میں داخل کر دیا ہے[1]۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کا قول گزر چکا ہے، پس معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کا ہر حدیث کے متعلق وضع کا فیصلہ نامناسب ہے، علامہ سیوطیؒ کی کتاب ''**القول الحسن في الذب عن السنن**'' اور ''جامع ترمذی'' اور دیگر صحاح وغیرہ پر علامہ ابن جوزیؒ کے اعتراضات وجوابات معلوم کرنے کے لئے ''**التعقبات على الموضوعات**'' (جو چھپ چکی ہے) کا مطالعہ ضروری ہے، اس ناچیز نے ایک رسالہ میں ان احادیث کو جمع کر کے ان کا دفاع کیا ہے، ''**الدقاع عما أورده ابن الجوزي على الصحاح**''، یہ غیر مطبوع ہے۔

جامع ترمذی کی شروح

''جامع ترمذی'' کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر علماء ومحدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتناء کیا اور اس کی متعدد شرحیں اور حواشی و مستخرجات لکھے گئے، طوالت کے سبب ان سب کا تعارف یہاں مشکل ہے، البتہ چند مشہور ومتداول شروح وحواشی یہ ہیں:

(۱) شروح أربعہ: یہ ''جامع ترمذی'' کی چار شرحیں:

۱: **عارضة الأحوذي لا بن العربي.**

۲: **قوت المغتذي للسيوطي.**

---

[1] تدریب ص۱۵۵

۳:　شرح أبوطیب مدنی المتوفی ۱۱۰۹ھ

۴:　شرح سراج احمد سرہندی، اس سب کا مجموعہ ہے، ایک ہی ساتھ شائع کیا گیا ہے، شروح أربعہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۳)　''عارضۃ الأحوذی'' لابن العربی مالکی (المتوفی ۵۴۳ھ) کی شرح مصر سے چھپ کر مکمل آ گئی ہے۔

(۴)　''قوت المغتذی'' جو علامہ سیوطیؒ کی کتاب ہے، اس کی تلخیص علامہ دمنتی المتوفی ۱۳۰۶ھ نے کی ہے، جو ''نفع قوت المغتذی'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے اور ہندوستان میں ''ترمذی شریف'' کے حاشیہ پر بھی چھپی ہے۔

(۵)　حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس الشافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح جو نا مکمل طور پر مدینہ منورہ کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کا کچھ حصہ قلمی ہندوستان کے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہے، اس کا ابتدائی حصہ دو جلدوں میں مصر سے طبع ہوا ہے، اس شرح کی تکمیل حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے کی ہے اس کے چند اوراق مرکز الشیخ أبی الحسن الندویؒ میں موجود ہیں۔

(۶)　''شرح الجامع للترمذی'' للحافظ ابن رجب حنبلی المتوفی سنہ ۷۹۵ھ، تاریخ التراث میں شرکین نے اس کے مخطوطہ کا ذکر کیا ہے۔

(۷)　شیخ ابوالحسن سندی مدنی المتوفی ۱۱۳۹ھ کا بھی ترمذی پر حاشیہ ہے۔

(۸)　''تحفۃ الأحوذی'': مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ کی یہ کتاب چھپ گئی ہے اور اس کے مقدمہ سے راقم نے بھی اس مضمون میں استفادہ کیا ہے۔

(۹)　''جامع الترمذی'': شیخ احمد محمد شاکر مرحوم نے پوری کوشش کتاب کی تحقیق و

تصحیح پر صرف کی ہے، مختصراً تعلیق بھی لکھی ہے، مگر صرف کتاب البیوع تک یہ کام ہوسکا ہے مصر سے تین جلدوں میں طبع ہوئی، اس کے بعد ابراہیم عطوہ نے بقیہ دو جلدوں میں کتاب کو مکمل کیا جواب ۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۱۰) ''العرف الشذی'': کے نام سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے اِفادات ان کے ایک شاگرد نے جمع کئے ہیں۔

(۱۱) ''معارف السنن'': حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ، حضرت شاہ صاحبؒ کے اِفادات کی روشنی میں نہایت محققانہ شرح تصنیف فرمائی ہے، حضرت مولانا (باب التلبیہ) کتاب الحج تک پہونچ سکے تھے کہ وصال ہوگیا، یہاں تک کتاب ٦ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۱۲) ''الکوکب الدری'': حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، یہ ''جامع ترمذی'' پر حضرت مولاناؒ کے اِفادات ہیں جسے حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ نے مرتب کیا تھا اور حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کے حواشی نے چار چاند لگا دیئے ہیں اور حلِ کتاب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری، پہلے دو جلدوں میں شائع ہوئی اور اس کے بعد عربی ٹائپ میں چار جلدوں میں شائع ہوئی، امام ترمذی پر بھی اس ناچیز کا عربی میں مقالہ شائع ہو چکا ہے، ان شاء اللہ مع متن شائع کرانے کا ارادہ ہے، واللہ الموفق۔

اور ڈاکٹر نور الدین عتر کی کتاب'' **الإمام الترمذي و الموازنة بين جامعه و بين الصحيحين** '' جو مصر سے شائع ہو چکی ہے، بہت مفید و مفصل کتاب ہے۔

امام نسائیؒ

نام ونسب نام احمد ہے اور کنیت ابوعبدالرحمٰن، پورا نسب نامہ یہ ہے: احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔

خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے سیکڑوں نامور فضلاء اس کی خاک سے اٹھے ہیں، امام نسائی بھی اسی خاک کے ایک مایۂ ناز فرزند تھے، ''نسأ'' خراسان کا ایک شہر ہے جو مرو کے قریب واقع ہے [۱]، اس کو امام موصوف کے مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اور اسی کی طرف منسوب ہوکر آپ نسائی کہلاتے ہیں۔

مؤرخ ابن خلکان رقم طراز ہیں: "**نسبته إلى نسأ – بفتح النون و فتح السين المهملة و بعدها همزة– وهی مدينة بخراسان خرج منها جماعة من الأعيان**" [۲]، یہ ''نسأ'' کی طرف منسوب ہے جس میں نون وسین دونوں مفتوح ہیں اور اس کے بعد ہمزہ واقع ہے، یہ خراسان کا ایک مشہور شہر ہے جہاں سے بہت سے اربابِ فن پیدا ہوئے، نسائی ہمزہ کے مد اور قصر دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے [۳]۔

پیدائش اور ابتدائی حالات امام موصوف ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، خود فرماتے

۱؎ مرقاۃ ص۲۳ ۲؎ وفیات ج۱ ص ٦٦ ۳؎ بستان ص۱۲۳

ہیں:

"يشبه أن يكون مولدي في سنة ٢١٥ھ". — اندازہ ہے کہ میری پیدائش ۲۱۵ھ میں ہوئی ۱؎۔

اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی تھی، لیکن اس زمانہ میں خراسان کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا، بہت سے ارباب فضل وکمال موجود تھے، اسی لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ ابتدائی تعلیم امام نسائی نے یہیں حاصل کی ہوگی۔

سماعِ حدیث کے لیے سفر امام نسائی جس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اس وقت علمِ حدیث کے لیے گھربار چھوڑنا اور دور دراز ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار بن چکا تھا، آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، محدثین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب میں ملکوں ملکوں پھرنا، سیکڑوں میل پاپیادہ طے کر لینا، بِرّ اعظموں اور سمندروں کو پار کرنا، اس دور کے علماء کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے طلبِ حدیث کے لیے رحلت کا یہ ضابطہ بیان کیا ہے:

"وصفة الرحلة: حيث يبتدئ بحديث أهل بلده، فيستوعبه، ثم يرحل فيحصّل في الرحلة ما ليس عنده" ۲؎. — اور رحلت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں سے ابتدا کرے اور جب وہ پورے طور سے حاصل کر چکے تو پھر اور شہروں کا سفر کرے اور اس سفر میں ان روایات کو حاصل کرے جو اس کے پاس نہ ہوں۔

۱؎ تہذیب ج۹ص ۳۸ — ۲؎ شرح نخبہ مع شرح القاری ص ۸۰۹، وبستان المحدثین ص ۱۳۲

اسی ضابطہ کے بموجب امام نسائیؒ اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۳۰ھ میں سب سے پہلے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں حاضر ہوئے [۱]۔

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

"رحل إلى قتيبة وله خمس عشرة سنة فقال: أقمت عندهٗ سنة وشهرين" [۲].	سب سے پہلے امام قتیبہ کی خدمت میں سفر کر کے گئے جب کہ عمر شریف پندرہ سال کی تھی اور ان کے پاس ایک سال دو ماہ قیام رہا۔

ان کے علاوہ دوسرے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

"رحل إلى الآفاق، و اشتغل بسماع الحديث و الاجتماع بالأئمة الحذاق".	نیز جن مشائخ سے بالواسطہ حدیثیں سنی تھیں، ان سے مشافہۃً بھی روایت کیا ہے [۳]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں: "انہوں نے بہت سے شہروں کے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کیا، خراسان، عراق، حجاز، جزیرہ، شام و مصر اور اس کے علاوہ بھی [۴]، اس سے سفر کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اس کے بعد امام صاحبؒ نے مصر کو اپنے علوم کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا، علامہ ابن حجر نے ابن یونسؒ کا

---

[۱] بستان ص ۱۳۲ — [۲] تذکرہ ج ۲ ص ۵۴

[۳] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲۶۳ — [۴] بستان ص ۱۲۳

قول نقل کیا ہے: ''**قدم مصر قديما و كتب بها و كتب عنه**''[۱]۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

در مصر مسکن داشت، و تصانیف او دراں دیار منتشر ست، و مردم بسیار از واخذ وتحمل حدیث کردہ اند، پس از مصر بدمشق آمد[۲]۔	مصر میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی، ان کی تصانیف اسی اطراف میں پھیلیں اور بہت سے لوگوں نے امام صاحب سے اخذ و روایت حدیث کیا ہے، آخری زندگی ذیقعدہ ۳۰۲ھ میں مصر سے دمشق آ گئے تھے[۳]۔

شیوخ واساتذہ | ان کے شیوخ واساتذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''**سمع من خلائق لا يحصون**''[۴]۔

اوپر گذر چکا ہے کہ سب سے پہلے قتیبہ بن سعید المتوفی ۲۴۰ھ کی خدمت میں سفر کیا، علامہ ذہبیؒ نے ان کو شیخ الحافظ اور محدث خراسان کے لقب سے یاد فرمایا ہے، بلخ کے رہنے والے تھے[۵]، ان کے شیوخ میں اسحاق بن راہویہ، محمد بن نصر، علی بن حجر یونس بن عبدالاعلیٰ، محمد بن بشار، امام ابوداؤد سجستانی وغیرہم ہیں، امام بخاریؒ کو بھی حافظ ابن حجرؒ نے امام نسائی کے اساتذہ میں شمار کیا ہے، ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی سے امام نسائی کا روایت کرنا ثابت ہے۔

تلامذہ | امام نسائی کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کے لیے مرجع

---

[۱] تہذیب التہذیب ج۱ص۲۸ — [۲] اشعۃ اللمعات ج۱ص۷ طبع قدیم

[۳] تہذیب التہذیب ج۱ص۲۷ — [۴] تہذیب ج۱ص۳۷ — [۵] تذکرہ ج۲ص۲۴۳

بنا دیا تھا، ان کے تلامذہ میں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی ملتے ہیں، خود امام صاحب کے صاحبزادے عبدالکریم، ابوبکر بن احمد بن محمد بن اسحاق ابن السنی ۳۶۳ھ، ابوعلی حسن بن خضر الأسیوطی، حسن بن رشیق عسکری، حافظ ابوقاسم حمزہ بن محمد بن علی کنانی ۳۵۷ھ، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن زکریا بن حیویہ، محمد بن معاویہ بن الاحمر، محمد بن قاسم الاندلسی متوفی ۳۲۸ھ، علی بن ابوجعفر طحاوی، احمد بن محمد بن مہندس، ان حضرات نے آپ کی کتاب ''السنن'' کی روایت بھی کی ہے [۱]۔

ان کے علاوہ ان کے تلامذہ ابوبشر دولابی، ابوجعفر طحاوی وغیرہم ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے ایک طویل فہرست بیان کی ہے اور فرمایا: ''**وأمم لا یحصون**'' [۲]، ان رواۃ مذکورین میں امام علی بن ابی جعفر طحاوی المتوفی ۳۵۱ھ اکابر حنفیہ میں سے ہیں اور بڑے پایہ کے محدث گذرے ہیں، یہ مشہور امام وقت ابوجعفر طحاوی کے صاحبزادے ہیں، جن کی کتاب ''شرح معانی الآثار'' علم حدیث کی ایک بے نظیر کتاب ہے، اور نہایت مشہور ومتداول ہے۔

امام نسائی کا زہد وتقویٰ زہد وتقویٰ میں یکتائے روزگار تھے، ''**کان ورعاً متورعاً**''، جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ عزوجل نے اتنے بلند مقام تک پہونچایا، ''**یصفون من اجتهاده في العبادة بالليل و النهار، و مواظبته على الحج و الجهاد، و إقامته السنن الماثورة، واحترازه عن مجالس السلطان، و إن ذلک لم يزل دأبه إلى أن استشهد**'' [۳].

---

[۱] تہذیب التہذیب ج۱ص۳۷ [۲] ایضاً ج۱ص۳۷

[۳] تہذیب ج۱ص۳۸

صوم داؤدی کے پابند تھے، ایک روز روزہ رکھتے تھے اور دوسرے روز افطار کرتے تھے [1]، حافظ محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ میں نے مصر میں اپنے مشائخ سے سنا کہ وہ بیان کرتے تھے کہ امام نسائی کے دن ورات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا، اکثر حج کیا کرتے تھے، جہاد کا جذبہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شرکت بھی کی تھی، ان کی شجاعت و بہادری کے لوگ معترف ہوگئے، انہوں نے حضور ﷺ کی سنتوں کو قائم کیا، بادشاہوں کی مجالس سے ہمیشہ گریز کیا، اس کے باوجود کھانے پینے میں ہمیشہ کشادہ دست رہے، تاشہادت ان کی زندگی اسی پر قائم رہی [2]، سنت کی اشاعت، بدعت سے نفرت پر ان کی شہادت کا واقعہ خود ایک واضح دلیل ہے، نیز اس سے امام صاحب کی حق گوئی و بیباکی کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو مردانِ خدا کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے، کچھ دنوں تک ''حمص'' کے قضاء کے عہدہ پر بھی فائز رہے [3]۔

علماء ومعاصرین کا اعتراف مؤرخ ابن خلکان نے ان الفاظ سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

''**كان إمام عصره في الحديث**'' [4]، ابوسعید عبدالرحمٰن نے اپنی ''تاریخ مصر'' میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ''**كان إماماً في الحديث، ثقة ثبتاً حافظاً**''، وہ حدیث میں امام، ثقہ، معتبر اور حافظ تھے [5]۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں:

---

[1] وفیات ج ۱ ص ۷۸ [2] تذکرہ ج ۲ ص ۲۸۸

[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۶۵ [4] وفیات الأعیان ج ۱ ص ۷۷

[5] وفیات الأعیان ج ۱ ص ۷۸، وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۰۱

''أبو عبدالرحمن النسائي مقدم على كل من يذكر بهذا العلم من أهل عصره''.	ابوعبدالرحمٰن نسائی اپنے زمانہ کے تمام محدثین سے (شیخین کے بعد) بلندواونچے تھے۔

حاکم نے دارقطنی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے ان سے سنا کہ امام نسائی جرحِ رواۃ، فنِ حدیث، فنِ تنقید اور احتیاط میں اپنے معاصرین سے کہیں فائق تھے[۱]۔

ابوبکر حداد نے باوجود کثیر الحدیث ہونے کے صرف امام نسائی سے روایت کی، فرماتے تھے کہ میں نے ان کو اپنے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان حجت بنایا ہے۔

حافظ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے:

''هو الإمام في الحديث بلا مدافعة''.	وہ بغیر کسی تقابل حدیث میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں[۲]۔

حافظ ابن حجرؒ، علامہ ذہبی اور ابن کثیر وغیرہ نے بہت سے اہل علم کے اقوال نقل کیے ہیں، جنہوں نے نسائی کی رفعت شان وفضل کا اعتراف کیا ہے۔

صاحب ''الحطة'' فرماتے ہیں: ''**وكان أحد الأئمة الحفاظ و أعلام الدين و أركان الحديث، إمام أهل عصره وعمدتهم وقدوتهم، وجرحه وتعديله، معتبر بين العلماء**''[۳].

ناقدین فن کی ایک جماعت نے جلالتِ علمی کے لحاظ سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بڑھا ہوا بیان کیا ہے۔

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۶۴ ۲۔ تہذیب ج ا ص ٦٦

۳۔ الحطہ ص ۲۵۳

علامہ تاج الدین سبکی ''طبقات الشافعیہ الکبریٰ'' میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے شیخ حافظ ابوعبداللہ ذہبی سے سوال کیا کہ آیا مسلم ابن حجاج حدیث کے زیادہ حافظ ہیں یا امام نسائی؟ فرمایا امام نسائی، پھر شیخ امام والد (حافظ تقی الدین سبکی) سے اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس سے موافقت کی'' ۱؎۔

حافظ شمس الدین ذہبی سیر'' أعلام النبلاء'' میں امام نسائی کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''هو أحذق بالحديث و علله و رجاله من مسلم و الترمذي و أبي داود و هو جار في مضمار البخاري و أبي زرعة'' ۲؎.	یہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد سے حدیث عللِ حدیث اور علم الرجال میں زیادہ ماہر ہیں اور بخاری و ابوزرعہ کے ہمسر ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رقم طراز ہیں:

''قدمه قوم من الحذاق في معرفة ذلک على مسلم بن الحجاج، و قدمه الدار قطني وغيره في ذلک على إمام الأئمة أبي بكر بن خزيمة صاحب الصحيح'' .	فن رجال میں ماہرین کی ایک جماعت نے امام مسلم بن حجاج پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ صاحب ''الصحیح'' پر بھی مقدم رکھا ہے ۳؎۔

۱؎ طبقات الشافعیہ ج۲ص۸۲ ۲؎ توضیح الافکار ج۱ص۲۲۰ وسیر أعلام ج۱۴ص۱۳۳
۳؎ مقدمۂ فتح الباری ص۸

گو یہ قول جمہور کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے تاہم اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ امام نسائی کا پایہ بہت بلند تسلیم کیا گیا ہے۔

امام نسائی پر دَورِ ابتلاء اور وفات امام صاحبؒ کو مصر میں جو شہرت وعظمت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بناء پر حاسدین نے حسد کیا، اس لیے انہوں نے ذیقعدہ ۳۰۲ھ میں مصر کو خیر باد کہا اور وہاں سے فلسطین کے ایک مقام رملہ آ گئے تھے، چونکہ شام میں بنی امیہ کی طویل حکومت کے سبب سے خارجیت و ناصبیت کا زور تھا، عوام حضرت علی مرتضیٰؓ سے بدگمان تھے اس لیے امام نسائی دمشق تشریف لے گئے اور جامع دمشق میں منبر پر چڑھ کر ''کتاب خصائص علیؓ'' سنانی شروع کی، ابھی تھوڑی ہی سی پڑھی تھی کہ کسی سائل نے سوال کیا کہ آپ نے امیر معاویہؓ کے فضائل پر بھی کوئی کتاب لکھی ہے، فرمایا کہ معاویہؓ کے لئے یہی کافی ہے کہ برابر سرابر چھوٹ جائیں، دوسری روایت ہے جو فی الواقع اقرب معلوم ہوتی ہے کہ مجھ کو ان کے مناقب میں بجز اس حدیث '' **لا أشبع الله بطنک**'' [1] کے اور کوئی حدیث نہیں پہونچی، اس پر عوام نے مشتعل ہوکر امام صاحب پر تشیع کا الزام لگا کر زدوکوب شروع کردی، امام صاحب کے نازک مقام پر چند سخت چوٹیں آئیں جن کے سبب سے امام صاحب نیم جاں ہوگئے، ایسی حالت میں لوگ مکان پر لائے، امام صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو مکہ مکرمہ لے چلو تا کہ میرا انتقال مکہ معظّمہ میں ہو، بالآخر ایسی حالت میں وہ اپنے خدا سے جا ملے اور مکہ مکرمہ میں امام صاحب کا انتقال ۱۳؍صفر ۳۰۳ھ بروز دوشنبہ ہوا، صفا و مروہ کے درمیان تدفین ہوئی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ رملہ ہی میں سپرد خاک کیے گئے اور ماہ شعبان میں

---

[1] ''البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ص ۱۶۵، و''وفیات الأعیان'' ج ۱ص ۷۷

وفات ہوئی، انتقال کے وقت عمر ۸۸ سال کی تھی [۱]۔

امام نسائی پر تشیع کا شبہہ غلط ہے اوپر گزر چکا ہے کہ شام میں خارجیت کا زور تھا حضرت علیؓ کے مخالفین بڑی تعداد میں موجود تھے، اس لیے امام صاحب نے کتاب ''خصائص علیؓ'' لکھی تا کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور برملا حق کا اظہار کیا، اس لیے لوگوں نے تشیع کا الزام لگایا۔

حیرت ہے ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے کہ ''**كان يتشيع**'' [۲] اور ابن کثیر نے بھی تحریر کیا ہے ''**إنه كان ينسب إليه شيء من التشيع**'' [۳]، یعنی کچھ شیعیت کا اثر تھا، اور متأخرین تک اسی نقل در نقل کا سلسلہ چلتا رہا، مگر حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ ذہبی ان دونوں نے اس سے سکوت کیا ہے، بلکہ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ اس کے بعد امام صاحبؒ نے فضائل صحابہؓ پر مستقل ایک تصنیف فرمائی، جس سے خود بخود تشیع کا شبہہ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، البتہ اس کا احتمال ہوسکتا ہے، حالات کے پیشِ نظر حضرت علیؓ واہل بیت کے دفاع میں کچھ تشدد پیدا ہو گیا ہو، ورنہ ان کی ''سنن'' کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل واشگاف ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین میں امام نسائی اسی ترتیب کے قائل ہیں جو جمہور اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے، مثلاً: ''**باب إمامة أهل العلم و الفضل**'' میں یہ حدیث نقل کی ہے:

لما قبض رسول الله ﷺ قالت الأنصار: منا أميرٌ و

---

[۱] وفیات الأعیان ج ۱ ص ۵۹ و بستان ص ۱۲۳ و تذکرہ ج ۲ ص ۶۶

[۲] ''سیر أعلام النبلاء'' ج ۱۴ ص ۱۳۳، و ''توضیح الأفکار'' ج ۱ ص ۱۹۸

[۳] ''هدي الساري مقدمۂ فتح الباری'' ص ۱۴

منكم أميرٌ ، فأتاهم عمر ﷺ، فقال: ألستم تعلمون أن رسول الله ﷺ و سلم قد أمر أبا بكر أن يصلي بالناس، فأيكم تطيب نفسه أن يتقدم أبا بكر قالوا: نعوذ بالله أن نتقدم أبا بكر"[۱].

امام نسائی کا مسلک دیگر محدثین کی طرح امام نسائی کے فقہی مسلک کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ائمۂ مجتہدین میں سے کس کے مسلک کی طرف ان کا انتساب ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں: او شافعی المذہب بود، چنانچہ مناسکِ او برآں دلالت می کند[۲]۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی تائید کی ہے، اور امام نسائی کو شوافع میں شمار کیا ہے[۳]۔

فی الواقع حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک بھی ان کا انتساب مسلک شافعی کی جانب مناسب ہے[۴]، لیکن حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا قول ''فیض الباری'' میں ہے کہ:

"الإمام أبوداود و النسائی حنبليان صرح به الحافظ ابن تيمية، و زعم آخرون أنهما شافعيان و لكن الحق أنهما حنبليان"[۵].

---

[۱] سنن نسائی ج۲ ص۷۴ [۲] بستان ص۱۲۳ [۳] ابجد العلوم ص۸۱۰
[۴] الإنصاف فی بیان سبب الاختلاف ص۸۰ [۵] فیض الباری ج۱ ص۵۸ و معارف السنن ص۲۲

اوران کی ''سنن'' کے مطالعہ کے بعد بظاہران کا حنبلی ہونا معلوم ہوتا ہے، مثال کے طور پرامام احمدؒ کے نزدیک جمعہ کی نماز قبل الزوال جائز ہے، چنانچہ ''بـاب وقـت الـجـمـعة'' ترجمہ قائم کیا ہےاور باب کے تحت کی روایات جن سے حنابلہ کا استدلال ہےصرف انھیں کونقل کیا ہےاور جمہورائمہ ثلاثہ کی دلیل حضرت انسؓ کی صریح روایت ''كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس'' [1]،کوترک کردیا ہے۔

اسی طرح ترجمہ قائم کیا ہے '' باب اغتسال الرجل و المرأة من إناء واحـــد'' [2]، جمہور کےنزدیک شوہرو بیوی ایک ساتھ غسل جنابت کررہے ہوں تو دونوں کاغسل بالاتفاق ہوجائے گا،لیکن اگرعورت مرد سے پہلے غسل کرے تواس کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے شوہرکوغسل کرنا امام احمدؒ کےنزدیک ناجائز ہےاورائمہ ثلاثہ کےنزدیک جائز ہے۔

چنانچہ امام نسائیؒ نے اس ترجمہ کے تحت حضرت عائشہؓ کی روایت کونقل کیا ہے جس سے ان کاحضور ﷺ کے ساتھ ساتھ غسل کرنا ثابت ہے،اس کے بعد دوسرا ترجمہ ''بـاب الرخصة في ذلک''، قائم کیا ہے جوفی الواقع جمہور کا متدل بیان کرنے کے لیے ہے،لیکن اس کے لیے جوروایت نقل کی ہے وہ جمہور کے مسلک پرصریح دلالت نہیں کرتی،حالانکہ حضرت میمونہؓ کی مشہورروایت جمہور کا متدل ہے،اس کواس باب میں ترک کردیا ہے۔

حلیہ شریف | امام نسائی کوحق تعالیٰ نےحسن سیرت کےساتھ حسن صورت بھی عطا کیا تھا،امام صاحب بڑے وجیہ وشکیل تھے،چہرہ نہایت پُرشکوہ اور روشن تھا،رنگ نہایت

---

[1] ترمذی ص ٦٦ [2] سنن نسائی ص۴۳

سرخ وسفید تھا، یہاں تک کہ بڑھاپے میں بھی حسن وتروتازگی میں فرق نہیں آیا تھا۔

لباس نہایت نفیس استعمال کرتے تھے، رنگین وقیمتی لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، بہترین غذائیں کھاتے، مرغ خرید کر پالتے اور خوب فربہ کر کے کھاتے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ (شربت) پیتے تھے، چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں [۱]، البتہ ان کی اولاد میں صرف صاحبزادہ عبدالکریم کا نام معلوم ہے۔

تصنیفات امام صاحبؒ نے مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ درج ذیل ہیں:

السنن الکبریٰ، و الصغریٰ، خصائص عليؓ، مسند عليؓ، مسند مالک، الکنی، عمل الیوم و اللیلة، أسماء الرواة و التمییز بینهم، کتاب الضعفاء و المتروکین (في رواة الحدیث) طبع فی الهند ۱۳۲۳ھ مع کتاب المفردات و الوحدان للامام البخاري، الضعفاء و الإخوة ما أغرب شعبة علی سفیان و سفیان علی شعبة، مسند منصور ابن زاذان وغیر ذلک [۲]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''کتاب الجمعۃ'' اور استاذ خولی نے ''کتاب المدلسین'' کا تذکرہ کیا ہے [۳]، ان تمام مذکورہ بالا کتب میں کتاب الضعفاء والمتروکین و تفسیر القرآن، السنن الکبری، والسنن الصغری، وخصائص علیؓ وعمل الیوم و اللیلۃ طبع ہوچکی ہیں، ''کتاب الصعفاء'' میں انہوں نے بہت سے ثقات کو ضعیف کہہ دیا ہے، ممکن ہے امام نسائیؒ کے نقد رجال میں تشدد سے فائدہ اٹھا کر بعض لوگوں نے الحاقی عبارتوں کا اضافہ کردیا ہو جیسا کہ ''میزان الاعتدال'' میں امام صاحبؒ کا ذکر الحاقی ہے [۴]۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج۱۱ص ۱۶۵ — [۲] تدریب طبع جدید ص ۵۱۶

[۳] بستان ص ۱۲۵ ومفتاح السنۃ ص ۱۵۳ — [۴] ماتمس إلیہ الحاجۃ ص ۴۷

سنن کی تالیف امام نسائیؒ کی تالیفات میں ''سنن'' کے نام سے ان کی دو کتابیں ہیں، ''سنن کبریٰ''، ''سنن صغریٰ''، لیکن ''صحاح ستہ'' میں ''سنن صغریٰ'' شامل ہے، جس کا دوسرا نام ''المجتنیٰ'' یا ''المجتبیٰ'' ہے، دونوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ جب ''سنن کبریٰ'' کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو امیر رملہ [1]، کی خدمت میں پیش کیا، امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ اس میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے؟ امام صاحب نے فرمایا نہیں، اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لئے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے، تب امام صاحبؒ نے ان کے لئے ''سنن صغریٰ'' تصنیف فرمائی [2]۔

اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن اثیر نے بھی ''جامع الأصول'' میں کیا ہے، ملا علی قاریؒ نے بھی اس کو ''مرقاۃ'' میں سید جمال الدین کے حوالے سے نقل کیا ہے [3]، لیکن علامہ ذہبیؒ نے ''سیر أعلام النبلاء'' کے اندر امام نسائیؒ کے ترجمہ کے تحت اس واقعہ کی تصریح یوں کی ہے کہ:

إن هذه الرواية لم تصح ، بل "المجتبى" اختصار ابن السني تلميذ النسائي .	بے شبہہ یہ روایت صحیح نہیں ہے، بلکہ ''مجتبیٰ'' ابن السنی کا اختصار ہے جو نسائی کے شاگرد ہیں [4]۔

اس لئے مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کے نزدیک ''سنن صغریٰ'' ابن السنی کا اختصار اور انہیں کا مرہون قلم ہے، مگر امام نسائی کا خود اپنا بیان ہے جس کو ان کے شاگرد ابن

---

[1] رملہ، فلسطین بیت المقدس سے ۱۸ میل پر واقع ہے، حضرت داود وسلیمان علیہما السلام کا دار السلطنت تھا اور اب غیر آباد ہے، (معجم البلدان)   [2] بستان ص ۱۲۳   [3] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۳
[4] توضیح الأفکار ج ۱ ص ۲۲۱

الأحمر نے نقل کیا ہے کہ:

کتاب السنن (أي الکبریٰ) کله صحیح و بعضه معلول إلا أنه یبیّنه و المنتخب المسمیٰ ''بالمجتبی'' صحیح.	پوری کتاب السنن (الکبریٰ) کا بیشتر حصہ صحیح ہے اور بعض حدیثیں معلول ہیں تو ان کی علت کو بیان کر دیا اور اس کا انتخاب جو'' المجتبیٰ'' کے نام سے موسوم ہے وہ تمام تر صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سنن صغریٰ'' کا اختصار ابن السنی [۱] نے امام نسائی کے زیر نگرانی رہ کر کیا ہے، **یمکن حملها علی أن یکون ابن السني باشر اختصارها بأمر النسائي فلتحمل علیه هذه الروایة ، ولا یجترأ علی شق عصا الجماعة بقول محتمل** [۲]۔

سنن نسائی کی غرض امام نسائی زمانہ کے لحاظ سے اصحاب ''صحاحِ ستہ'' میں سب سے مؤخر ہیں، اور امام بخاری کی شخصیت سے زیادہ متأثر معلوم ہوتے ہیں، اس لئے انہوں نے اپنی کتاب میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے طریقے کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے، اس کے ساتھ حُسن ترتیب اور جودتِ تالیف میں بھی ممتاز ہے، چنانچہ حافظ ابوعبداللہ بن رُشید المتوفی ۷۲۱ھ فرماتے ہیں:

---

[۱] امام نسائی کے ''سنن الکبریٰ'' کے راوی ابن الأحمر ہیں جن کی کنیت ابوبکر اور نام محمد بن معاویہ المتوفی ۳۵۸ھ ہے اور ''سنن صغریٰ'' کا راوی ابن السنی ہے ان کی کنیت ابوبکر نام احمد بن محمد بن اسحاق دینوری المتوفی ۳٦۴ھ ہے، مشہور کتاب ''عمل الیوم و اللیلة '' اور دیگر کتابوں کے راوی ہیں، ۸۰؍سال کی عمر پائی تھی۔ (تذکرہ ج۳ ص۱۵۱)

[۲] الیانع الجني ص۵۳

إنه أبدع الكتب المصنفة في السنن تصنيفا و أحسنها ترصيفا، وهو جامع بين طريقي البخاري و مسلم مع حظ كثير من بيان العلل [1].	یہ کتاب علم سنن میں جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں ، ان سب میں تصنیف کے لحاظ سے انوکھی اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین ہے اور بخاری و مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے ، نیز عللِ حدیث کے ایک خاص حصہ کا بیان بھی اس میں آ گیا ہے۔

سنن کے محاسن وفضائل حافظ محدث ابوالحسن معافری المتوفی ۴۰۳ھ جو امام دارقطنی اور حاکم کے معاصر ہیں، فرماتے ہیں کہ:

"إذا نظرت إلى ما يخرجه أهل الحديث، فما خرجه النسائي أقرب إلى الصحة مما خرجه غيره [2].	جب تمام محدثین کی جمع کردہ حدیثوں پر نظر ڈالو گے تو جس حدیث کی امام نسائی نے تخریج کی ہوگی وہ دوسروں کی روایت کردہ حدیث کی بہ نسبت صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔

اسی لئے بعض مغاربہ "صحیح بخاری" پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں ، علامہ سخاوی تحریر فرماتے ہیں:

صرح بعض المغاربة بتفضيل كتاب النسائي علىٰ "صحيح البخاري" [3].	بعض مغاربہ نے صراحت کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو "صحیح بخاری" پر فضیلت حاصل ہے۔

---

[1] مقدمہ زہرالربی بحوالہ ماتمس الیہ الحاجۃ ص۸۹ [2] مقدمہ زہرالربی بحوالہ ماتمس الیہ الحاجۃ ص۹۰
[3] فتح المغیث ص۱۲

محدث ابن الأحمر نے اپنے بعض مکی شیوخ سے نقل کیا ہے:

إنه أشرف المصنفات كلها و ما وضع في الإسلام مثله[۱].	یہ اس فن کی تمام مصنفات سے افضل ہے اور اسلام میں اس کے مانند کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

مگر یہ گفتگو ''صحیحین'' کے علاوہ دیگر کتابوں سے تقابل کے طور پر کہی جاسکتی ہے کیونکہ ''صحیح بخاری'' کے بارے میں تو خود امام نسائی کا یہ قول حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ:

''ما في هذه الكتب كلها أجود من كتاب البخاري''.	ان تمام کتابوں میں بخاری کی کتاب سے زیادہ خوب کوئی کتاب نہیں۔

اس کے بعد حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں:

و النسائي لا يعني بالجودة إلا جودة الأسانيد.	نسائی کی مراد جودت سے جودتِ اسانید ہے[۲]۔

امام نسائی کے شرائط | مقدسی نے امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میں نے ''کتاب السنن'' کے جمع کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے ان شیوخ سے روایت کرنے میں استخارہ کیا جن کے متعلق میرے قلب میں کسی طرح کا شبہہ تھا، چنانچہ بہتر یہ معلوم ہوا کہ ان سے روایت نہ کروں، لہٰذا بہت سی ایسی روایتیں جنہیں میں عالی سند سے بیان کرسکتا تھا ان کو اسی وجہ سے سند نازل سے نقل کیا ہے[۳]۔

---

[۱] ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں شذ بعض المغاربة ففضّله علىٰ كتاب البخاري، ولعله لبعض الحيثيات الخارجة عن كمال الصحة والله أعلم (مرقاۃ ص۲۳)

[۲] مقدمۂ فتح الباری ص۱۰ [۳] شروط الأئمہ ص۱۸

اس کے بعد حافظ مقدسی لکھتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم سعد بن علی زنجانی سے مکہ معظّمہ میں ایک راوی کا حال دریافت کیا تو انہوں نے اس کی توثیق کی، میں نے عرض کیا کہ امام عبدالرحمٰن نسائی نے تضعیف کی ہے، اس پر امام موصوف نے فرمایا کہ:

یا بُنَيَّ ! إن لأبي عبدالرحمن في الرجال شرطاً أشد من شرط البخاري و مسلم .	بیٹا ! رجال کے بارے میں ابو عبدالرحمٰن نسائی کی شرط بخاری ومسلم کی شرط سے زیادہ سخت ہے [۱]۔

فی الواقع نسائی کی شرط ایسے لوگوں کی روایات کی تخریج ہے جن کے ترک پر اجماع نہ ہو (مراد خاص اجماع) بشرطیکہ اس حدیث کی سند متصل ہو اور انقطاع و اتصال نہ پایا جائے، اس کے باوجود امام نسائی نے بہت سے ایسے رجال سے جن سے ابوداود وترمذی روایت کرتے ہیں اجتناب کیا ہے، بلکہ ''صحیحین'' کے بہت سے رجال سے بھی روایت نہیں کی ہے، ولـذلک: ''**قيل إن لأبي عبدالرحمن النسائي شرطاً أشد من شرط البخاري و مسلم**'' [۲]، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ امام نسائی نے شیخین یا دونوں میں سے ایک کے بہت سے رواۃ کو ''کتاب الضعفاء والمتروکین'' میں داخل کیا ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس کا جواب دیا گیا ہے، امام نسائی کا یہ فیصلہ ان دونوں کتاب کے وجود میں آنے کے بعد تھا اس لئے کوئی حرج نہیں ہے، لیکن شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے شیخین کے رجال پر کلام اگر اپنے اجتہاد سے یا کسی معاصر سے نقل کیا ہے تو یہ جواب دیا جا سکتا ہے،

---

[۱] أیضاً ص ۱۸ از أبوالفضل بن طاہر مقدسی [۲] مقدمہ زہر الربیٰ ج ۱ ص ۴ وسیر أعلام النبلاء ج ۱۴ ص ۱۳۱

البتہ اگر اپنے کسی پیشرو سے نقل کر رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسی مرجح کی بنا پر اس سے روایت کر رہے ہوں جس سے اس کمی کی تلافی ہو رہی ہو[۱]، اس لئے ''شرط النسائی أشد من شرط البخاري ومسلم'' کہنا کسی طرح قابل قبول نہیں[۲]۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ خطیب وحاکم وغیرہ کا کہنا یہ ہے کہ **''کل ما فیه صحیحٌ''** اس قول میں صریح تساہل ہے[۳]، البتہ جیسا کہ علامہ سیوطی ''زہر الربیٰ'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ:'' **و بالجملة، فکتاب السنن بعد ''الصحیحین'' أقل حدیثا ضعیفاً و رجلاً مجروحاً، و یقاربه کتاب أبي داود و کتاب الترمذي**'' علامہ حازمی نے بھی یہی فیصلہ فرمایا ہے کہ امام زہری کے تلامذہ کا طبقہ ثالثہ جو ابوداود کی شرط ہے یہی امام نسائی کی بھی شرط ہے[۴]۔

علامہ حازمی اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے نزدیک ''صحیحین'' کے بعد اس کا تیسرا درجہ ہے[۵]، اگر چہ اس میں اختلاف بھی کیا گیا ہے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

سنن نسائی کی ایک اہم خصوصیت | امام نسائی امام ترمذی کی طرح رواۃ کے اسماء وکنیٰ کا پوری تشریح سے تعارف کراتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی خصوصی توجہ عللِ حدیث پر تنبیہ کرنے پر ہوتی ہے اور بعض مقامات پر اپنا فیصلہ بھی صادر فرماتے ہیں، جب **''قال أبو عبدالرحمن: هذا منکر و هذا صواب''** کہتے ہیں، اس وقت نہایت معرکہ پیش آ جاتا ہے پھر وہ بحث کافی غور وفکر کی طالب بن جاتی ہے۔

---

[۱] تدریب ص۶۵ [۲] مقدمۂ لامع ص۴۱ [۳] مرقاۃ ص۲۳
[۴] شروط الأئمہ ص۴۴ [۵] معارف السنن ص۱۶

سنن کے تراجم ابواب کسی محدث کی فقاہت کا اندازہ اس کے تراجم ابواب سے لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ''**فقه البخاري في تراجمه**''، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں:

(۱) وہ مسائل فقہ جن کو مصنف نے اختیار کیا ہے وہ تراجم سے ظاہر ہو جائیں گے۔

(۲) اس سے صاحبِ کتاب کی فقاہت، ذہانت اور دقتِ نظر بھی معلوم ہو جاتی ہے، اس حیثیت سے بخاری کے تراجم نہایت اہم ہیں، جن کو سمجھنے کے لئے بڑی دقتِ نظر و فقاہت کی ضرورت ہے اور اس کے بعد ابوعبدالرحمٰن نسائی کے تراجم ابواب ہیں، مگر بہت سی جگہوں پر دونوں کتابوں کے تراجم حرفاً حرفاً موافق ہیں، ایسی صورت میں توارد پر محمول کرنا مشکل ہے، میرا خیال ہے کہ اس کو مصنف نے اپنے شیخ امام بخاری سے لیا ہے اور یہ احتمال قوی ہے جب کہ امام بخاری ان کے شیوخ میں ہیں، اس کے بعد علی الترتیب ابوداود و ترمذی کے تراجم ہیں مگر سب سے آسان ترمذی کے تراجم ہیں اور ان کا سمجھنا بھی کچھ دشوار نہیں اور ''مسلم'' کے تراجم مصنف نے بذات خود قائم نہیں کئے ہیں بلکہ بعد میں علامہ نوویؒ نے قائم فرمائے ہیں مگر بخاری کے تراجم سے اسے کوئی نسبت نہیں [۱]۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تقریر سے معلوم ہوا کہ ''سنن نسائی'' کے تراجم نہایت مہتم بالشان ہیں، امام نسائی نے امام بخاری کے طرز پر تراجم قائم کئے ہیں، مثلاً امام بخاری کبھی مختصر روایت نقل کرتے ہیں اور حدیث کے ایسے جزء سے ترجمہ پر استدلال فرماتے ہیں جو اس باب کے علاوہ دوسری جگہ کتاب میں ہے، اس سے مقصود

---

[۱] معارف السنن ص ۲۳

تشحیذ اذہان ہے، اسی طرح امام نسائی نے ترجمہ قائم کیا ہے: "**باب الإقامة لمن يصلي وحده**" ؎۱، اس باب میں یہ حدیث نقل کی ہے **عن رفاعة بن رافع أن رسول الله** ﷺ **بينما هو جالس في صف الصلوٰة** (الحدیث) اس حدیث سے ترجمہ ثابت نہیں ہورہا ہے مگر ص ۱۸۳ پر روایت آرہی ہے یعنی اعرابی والی حدیث اس کے بعض طرق میں **فتشهد و أقم** کا لفظ موجود ہے جس سے ترجمہ ثابت ہے۔

"سنن" کے تراجم ابواب امام نسائی کی فقاہت ودقتِ نظر کا واضح ثبوت ہیں اس لئے امام صاحب کے بارے میں ابن یونس کا ارشاد ہے "**كان إماماً ثقة ثبتاً حافظاً فقيهاً**" ؎۲۔

امام اعظمؒ اور امام نسائیؒ حافظ سخاویؒ فرماتے ہیں کہ حافظ ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب "السنہ" میں اور ابن عدی نے اپنی "کامل" میں اور خطیب نے "تاریخ بغداد" میں اور ان سے پہلے دوسرے لوگوں نے جیسے ابن ابی شیبہ نے "مصنف" میں اور امام بخاری ونسائی نے ائمۂ مجتہدین کے بارے میں جو کلام کیا ہے، میں ان ائمہ کو اعتراضات سے برتر سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے مقاصد نہایت اعلیٰ تھے، اس لئے ان معترضین کی پیروی سے اجتناب کرنا چاہئے ؎۳۔

جب امام نسائی مصر آئے تو وہاں امام طحاویؒ سے مذاکرے رہے، شاید اسی زمانہ میں ایک روایت امام اعظمؒ سے بھی کی ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ پر جو نقد کیا تھا اس سے رجوع کرلیا تھا ؎۴۔

؎۱ سنن نسائی ج ۱ ص ۱۱۲ — ؎۲ المنتظم ج ۶ ص ۱۳۱

؎۳ الإعلان بالتوبیخ ص ۶۵ — ؎۴ ماتمس إليه الحاجة ص ۲۸ تا ۳۳

وہ روایت یہ ہے:

"حدثنا علي بن حجر، ثنا عيسى هو ابن يونس عن النـعـمـان يعني أبا حنيفة عن عاصم عن أبي رزين عـن ابـن عبـاس رضي الله تعالىٰ عنهما قال : ليس على من أتى بهيمة حدٌ ".

یہ حدیث ابن السنی کی روایت میں نہیں ہے، لیکن ابن الأحمر، ابوعلی الأسیوطی اور مغاربہ کے نسخوں میں موجود ہے [۱]۔

ایک لطیفہ "سنن نسائی" اپنی اہمیت کے باوجود امام بیہقی کے پاس نہیں تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں: "لـم يكن عنده "سنن النسائي" و لا "جامع الترمذي" و لا "سـنـن ابن ماجه" [۲]، اسی طرح حاکم صاحب "مستدرک" کو بھی "سنن" کا سماع حاصل نہیں تھا، چنانچہ اس کا انہوں نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں تذکرہ کیا ہے [۳]۔

شروح وتعلیقات "سنن نسائی"، "صحاح ستہ" کا رکن عظیم ہے مگر افسوس کہ اس کی شروح وتعلیقات کی طرف وہ توجہ علماء نے نہیں کی جو دیگر کتب کی طرف کی گئی، چھ صدی گذرنے کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے اس پر تعلیق لکھی چنانچہ مقدمہ "زہر الربیٰ علی المجتبیٰ میں" لکھتے ہیں کہ جس طرح "صحیحین"، "سنن ابو داود"، "جامع ترمذی" پر میں نے تعلیقات لکھی ہیں، اسی طرح "سنن نسائی" پہ تعلیق

---

[۱] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہؒ [۲] ما تمس إلیہ الحاجۃ ص ۹۶

[۳] معرفۃ علوم الحدیث ص ۸۲

لکھی ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی، چونکہ اس کی تصنیف پر چھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کی کوئی شرح وتعلیق مشہور نہیں ہے، اور علامہ سیوطی نے اپنی تعلیق کا نام ''زہر الربیٰ'' رکھا ہے، مصنف کی دیگر تعلیقات کی طرح یہ تعلیق بھی بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔

دوسری تعلیق یا حاشیہ محمد بن عبدالہادی سندی المتوفی ۱۱۳۸ھ کا ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی تعلیق سے زیادہ مفصل ہے، اس میں متن کے ضروری مقامات کا حل اور اعراب کی تحقیق اور الفاظ غریبہ کی تشریح کی گئی ہے، یہ دونوں حاشیے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ نے ''سنن نسائی'' کی کتب و ابواب و احادیث کی ترقیم مطبوعہ ''سنن نسائی'' کے ساتھ کر دی ہے اور ایک مستقل جلد میں اس کی فہارس تیار کر کے بیروت سے شائع کرایا ہے۔

''شرح ابن الملقن'': مصنف کا اصل نام عمر بن علی بن احمد ہے، کنیت ابو حفص، لقب سراج ہے، المتوفی ۸۰۴ھ انہوں نے صحاح کی شروح لکھی ہیں، اس سلسلے میں ''زوائد النسائی علی الأربعۃ'' بھی ایک جلد میں مرتب کی تھی، اس میں ''سنن نسائی'' کی ان احادیث کی شرح ہے جو ''بخاری''، ''مسلم''، ''ترمذی'' اور ''ابوداود'' میں نہیں ہیں [۱]، مگر یہ نایاب ہے[۲]۔

---

[۲] هناك تعليقات على المجتبىٰ لبعض علماء الهند منها تعليق للمولوي وصي أحمد الحنفي الكانفوري و روض الربى شرح عليه بالأردو للمولوي وحيد الزمان اللكهنوي.

[۱] کشف الظنون ج۲ ص۳٦

تعلیق حضرت الأستاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ، یہ حضرت مولانا گنگوہیؒ وحضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا محمد یحییٰؒ وغیرہم کے افادات کا مجموعہ ہے، اس کے علاوہ ''زہرالربیٰ''، ''حاشیۂ سندی'' وغیرہ دیگر شروح کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے، اس میں مشکل مقامات کا حل، اغلاط طباعت کی تصحیح اور امام نسائی کے '' **هذا منكر و هذا صواب**'' پر محققانہ بحث ہے، اور اس کتاب کی خصوصیات وتراجم پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے، ''سنن نسائی'' کی یہ مختصر شرح علم حدیث کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے مگر افسوس کہ ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، راقم نے حضرت الأستاذ کے ''صحاح ستہ'' پر افادات کے مجموعوں کے ساتھ اس کو بھی نقل کیا ہے۔

اہل علم کے لئے یہ مژدہ ہے کہ یہ تعلیق محترم جناب مولانا محمد عاقل صاحب صدر المدرسین مدرسہ مظاہر علوم کے حواشی ومقدمہ کے ساتھ طبع ہورہی ہے، اس کی چند جلدیں چھپ چکی ہیں، اس کا نام ''الفیض السماوي'' ہے۔

اس ناچیز کا مفصل مقالہ بعنوان ''**الإمام النسائي و صناعته الحديثية في سننه**'' ''البعث الإسلامی'' میں آٹھ قسطوں میں شائع ہوچکا ہے، دارالقلم سے کتاب کی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔

امام ابن ماجہ

نام ونسب سلسلۂ نسب یہ ہے :ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی بالولاء القزوینی [۱]،کنیت ابوعبداللہ، نام محمد، الربعی القزوینی نسبت اور ابن ماجہ عرف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کے دادا کا نام عبداللہ لکھا ہے، ماجہ کے بارے میں اختلاف ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ آپ کی والدہ کا نام ہے، فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ماجہ آپ کی والدہ تھیں، اس لیے ابن میں الف لکھنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ابن ماجہ محمد کی صفت ہے نہ کہ عبداللہ کی [۲]،مگر عجالۂ نافعہ میں شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ''ماجہ لقب پدر ابوعبداللہ است نہ لقب جدا ونہ نام مادر'' [۳]،علامہ ابن کثیر نے حافظ خلیل قزوینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ماجہ یزید کا لقب ہے [۴]، چونکہ قبیلۂ ربیعہ سے ان کا رشتۂ موالات تھا، اس لیے ان کو ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہا جاتا ہے، جس طرح امام بخاری کو جعفی کہا گیا ہے۔

قزوینی ''قزوین'' کی طرف نسب ہے جو ایران کا مشہور شہر ہے، اسی کو امام صاحب کے مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

---

[۱] وفیات الأعیان ج ۳ ص ۳۰۸ [۲] بستان ص ۱۱۲

[۳] عجالہ نافعہ ص ۲۸ [۴] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۲

پیدائش اور ابتدائی حالات امام ابن ماجہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے [1]، انہوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت قزوین میں بڑے بڑے علماء مثلاً علی بن محمد ابوالحسن طنافسی المتوفی ۲۳۳ھ، عمرو بن رافع ابوحجر بجلی المتوفی ۲۳۷ھ) اسماعیل بن ابو سہل قزوینی (المتوفی ۲۴۷ھ) ہارون بن موسیٰ تمیمی (المتوفی ۲۴۸ھ) محمد بن ابی خالد قزوینی [2] وغیرہ مسند درس وافتاء پر جلوہ افروز تھے، امام صاحب نے پہلے ان سے استفادہ کیا، افسوس ہے کہ امام صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، بظاہر ابتداء عمر سے سماع حدیث کا آغاز کیا ہوگا۔

سماع حدیث کے لیے سفر قیاس ہے کہ امام صاحب نے ۲۳۰ھ کے بعد سفر کا آغاز کیا ہوگا، اس وقت عمر کا اکیسواں سال تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ علم حدیث انتہائی عروج پر تھا، امام صاحب نے طلب حدیث میں مختلف شہروں کی خاک چھانی۔

مؤرخ ابن خلکان کا بیان ہے:

ارتحل إلى العراق والبصرة و الكوفة وبغداد و مكة والشام ومصر والري لكتب الحديث [3].	حدیث لکھنے کے لیے عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، شام ومصر اور رَے کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

سمع بخراسان والعراق والحجاز ومصر والشام وغيرها من البلاد [4].	خراسان، عراق، حجاز، مصر وشام اور دیگر بلاد میں سماع حدیث کیا۔

---

[1] بستان ص۱۱۲ [2] تہذیب التہذیب ج۹ ص۵۳۱ [3] وفیات ج۴ ص۲۷۹ [4] تہذیب ج۴ ص۱۳

"وغیرھا من البلاد" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور شہروں کا سفر بھی کیا تھا جس کا ثبوت ان کے شیوخ کے ناموں سے بھی ملتا ہے۔

شیوخ وتلامذہ ان کے شیوخ کا استقصاء دشوار ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ جبارہ بن المغلس، وابراہیم بن المنذر، وابن نمیر، وہشام بن عمار اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے علم حدیث حاصل کیا، خصوصیت سے ابوبکر بن شیبہ سے استفادہ کیا[1]، ان کے شیوخ میں امام مالک اور لیث کے تلامذہ بھی ہیں[2]، ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، علی بن سعید بن عبداللہ العسکری، ابراہیم بن دینار الجرشی الہمدانی، احمد بن ابراہیم قزوینی جد ابویعلی خلیلی، ابوطیب احمد بن روح شعرانی اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ صفار، ابوالحسن علی بن ابراہیم بن سلمہ قزوینی، ابوعمرو احمد بن محمد بن حکیم مدنی اصبہانی وآخرون یعنی ان کے علاوہ اور بھی ہیں[3]۔

علماء کا اعتراف کمال امام صاحبؒ کے فضل وکمال اور جلالت شان، حفظ حدیث کا اعتراف ہر دور کے علماء وتذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

مؤرخ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: "**کان إماماً في الحديث عارفا بعلومه و جميع ما يتعلق به**"[4]۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ: "**هو أبو عبدالله محمد بن يزيد ابن ماجه صاحب كتاب "السنن" المشهورة، وهي دالة علىٰ عمله و علمه وتبحره واطلاعه واتباعه للسنة في الأصول والفروع**"[5].

---

[1] بستان ص ۱۲۵ [2] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۳ [3] تہذیب حوالۂ مذکور
[4] وفیات ج ۳ ص ۳۰۸ [5] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲

محدث ابویعلیٰ خلیلی کے الفاظ ہیں: ''**ابن ماجه ثقة كبير متفق عليه محتج به، له معرفة بالحديث وحفظه**''[۱].

علامہ ذہبی کی رائے ہے: ''**قد كان ابن ماجه حافظاً ناقداً صادقاً واسع العلم**''[۲].

حافظ ابن حجرؒ نے ''**أحد الأئمة، حافظ**''[۳]، لکھا ہے۔

مسلک امام صاحبؒ کا مسلک متعین طور پر معلوم نہیں ہوسکا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک امام احمدؒ کے مسلک کی طرف میلان تھا[۴]، مگر مولانا انور شاہ کی تحقیق ہے کہ شاید امام ابن ماجہ شافعی تھے[۵]، علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ وغیرہ علماء و ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، بلکہ ائمہ حدیث امام شافعی، احمد، اسحاق اور ابو عبیدہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے، یعنی اہل عراق کے مذہب کے مقابل میں اہل حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے[۶]، جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔

وفات حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے ''قزوین'' میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا نسخہ دیکھا تھا جو عہد صحابہؓ سے لے کر ان کے زمانہ تک کے رجال اور امصار کے حالات پر مشتمل ہے، اس تاریخ کے آخر میں امام صاحب کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ہے کہ ابو عبداللہ محمد بن یزید نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا، اور سہ شنبہ ۲۲/رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو دفن کیے گئے، میں نے خود ان سے سنا

---

[۱] تہذیب ج۹ ص۵۳۲ [۲] سیر أعلام النبلاء ج۱۳ ص۲۷۹ [۳] تقریب ج۲ ص۲۲۰
[۴] الإنصاف ص۴ [۵] معارف السنن ج۱ ص۲۲ [۶] توجیہ النظر ص۱۸۵

ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا تھا، اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر چونسٹھ سال کی تھی، ان کی وفات پر علماء نے مرثیے لکھے۔

تصنیفات مؤرخین نے امام صاحب کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے، (۱) التفسیر، (۲) والتاریخ، (۳) والسنن، تفسیر کے متعلق علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں، ''**لابن ماجه تفسير حافل**'' علامہ سیوطی نے ''**الإتقان**'' میں اس کو تفسیر ابن جریر کے طرز کی تصنیف بتایا ہے، ''التاریخ'' اس کو ابن خلکان نے ''تاریخ ملیح'' اور حافظ ابن کثیر نے ''تاریخ کامل'' سے تعبیر کیا ہے۔

سنن ابن ماجہ اور اس کی خصوصیات ان میں ''سنن ابن ماجہ'' سب سے اہم کتاب ہے، جس پر ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس کتاب کی افادیت واہمیت پر علماء ومحدثین کا اتفاق ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: **وكتابه في السنن جامع جيد** [1] ''ان کی کتاب سنن (احکام) میں ایک عمدہ جامع ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت مفید ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اس کی ترتیب وتبویب ہے [2]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس اجمال کی یہ تفصیل فرمائی ہے:

''وفی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار واختصار آنچہ ایں کتاب دارد ہیچ یک از کتب ندارد'' [3]۔

(۲) اس کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سی ایسی نادر حدیثوں پر

---

[1] تہذیب التہذیب ج۹ ص۵۳۱ [2] الباعث الحثیث ص۹۰ [3] بستان ص۱۲۵

مشتمل ہے جن سے صحاح خمسہ خالی ہیں، علامہ ابوالحسن سندی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہت سے ابواب میں ایسی حدیثوں کو نقل کیا ہے جو پانچوں مشہور کتابوں میں نہیں ہیں، اگر چہ وہ ضعاف ہیں، لیکن اسی مضمون کی دوسری حدیثیں بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

(۳) مصنف نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشان دہی بھی کی ہے، مثلاً "باب کل مسکر حرام" کے تحت دو روایتوں کو نقل کیا ہے۔

۱. حدثنا یونس بن عبد الأعلیٰ، ثنا ابن وهب أخبرنا ابن جریج عن أیوب بن هانئ عن مسروق، عن ابن مسعودؓ: أن رسول الله ﷺ قال: "کل مسکر حرام" إلخ.

اس کے بعد فرماتے ہیں "هذا حدیث المصریین" (یہ مصریوں کی حدیث ہے)۔

۲. حدثنا علي بن میمون الرقي ثنا خالد بن عیان، عن سلیمان بن عبدالله بن الزبرقان عن یعلی بن شداد بن أوس، سمعت معاویة یقول: "کل مسکر حرام" هذا حدیث الرقیین (یہ رقہ والوں کی حدیث ہے)۔

(۴) مختلف احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے حدیث نبوی سے اس عہد کے مسلمانوں سے تعلق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً "**باب ماجاء فیما یستحب من التطوع بالنهار**" کے تحت حبیب بن ثابت کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس حدیث کے راوی ابو اسحاق سبیعی کو مخاطب کر کے فرمایا "**ما أحب أن لي بحدیثک هذا ملء مسجدک ذهبا**" (مجھ کو تم نے

جوحدیث سنائی اس کے بدلے میں تمہاری مسجد کے برابر بھرا ہوا سونا لینا بھی پسند نہیں کرتا)۔

(۵) پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی حدیث بھی ہیں جب کہ امام مسلم و امام نسائی کی سب سے عالی روایت رباعیات ہیں جو ''سنن ابن ماجہ'' میں بکثرت موجود ہیں، البتہ ''صحیح بخاری'' میں بائیس اور ''جامع ترمذی'' میں ایک ایک ہے۔

یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں، اگرچہ امام ابن ماجہ کے طبقہ کے لحاظ سے بہت عالی ہیں، مگر سند کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص وزن نہیں ہے، اس کے ایک راوی کثیر بن سلیم پر محدثین نے جرح کی ہے، وہ روایات حسب ذیل ہیں:

(۱) حدثنا جبارة بن المغلس، ثنا كثير بن سليم، سمعت أنس ابن مالک يقول: قال رسول الله ﷺ: ''من أحب أن يكثر الله خير بيته فليتوضأ إذا حضر غداءه و إذا رفع'' ''باب الوضوء عند الطعام'' [۱].

(۲) حدثنا جبارة بن المغلس، ثنا كثير بن سليم عن أنس بن مالک قال: ''مارفع من بين يدي رسول الله ﷺ فضل شواء قط ولا حملت معه طنفسة'' [۲].

(۳) حدثنا جبارة بن المغلس، ثنا كثير بن سليم عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله ﷺ: ''الخير أسرع إلى البيت الذي يغشى من الشفرة إلى سنام البعير'' [۳].

---

[۱] سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۳۲۶۰ [۲] نفس المصدر رقم ۳۳۱۰ [۳] نفس المصدر رقم ۳۳۵۶

(۴) حدثنا جبارة بن المغلس، ثنا كثير بن سليم، سمعت أنس بن مالک يقول: قال رسول الله ﷺ: "ما مررت بليلة أسري بي بملاء إلا قالوا: مُرأ متک بالحجامة" ۱؎.

(۵) حدثنا جبار ة بن المغلس، ثنا كثير بن سليم عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله ﷺ: "إن هذه الأمة مرحومة، عذابها بأيديها، فإذا كان يوم القيامة دفع إلیٰ كل رجل من المسلمين رجل من المشركين، فيقال: هذه فداء ک من النار" ۲؎.

سنن ابن ماجہؒ کے متعلق امام ابوزرعہ رازی کا ارشاد عبیداللہ بن عبدالکریم بن یزید بن فروخ رازی المتوفی ۲۶۴ھ، علم حدیث کے مشہور امام ہیں، جن کے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابوحاتم، ابوزرعہ، ابن وارہ، یہ تین رے میں ایسے اشخاص ہیں جن کی نظیر اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں ۳؎۔

علامہ ذہبی، ابوزرعہ کے متعلق خود فرماتے ہیں:

كان من أفراد الدهر حفظاً وذكاءً و ديناً و علماً و عملاً ۴؎.

یہ حفظ حدیث، ذکاوت، دینداری، اور علم وعمل کے لحاظ سے ان لوگوں میں سے تھے جو یکتائے زمانہ ہوئے ہیں۔

انہوں نے "سنن ابن ماجہ" کو دیکھ کر یہ سند عطا فرمائی، "اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار ومعطل ہوکر رہ جائیں گی" ۵؎۔

۱؎ باب الحجامۃ رقم ۳۴۷۹ ۲؎ باب صفة أمة محمد ﷺ رقم ۴۲۹۲
۳؎ تذکرہ ج ۲ ص ۳۰ ۴؎ تذکرہ ج ۲ ص ۳۰ ۵؎ بستان ص ۱۲۲

حافظ ابوزرعہ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی، آج ہمارے سامنے بہت سی حدیث کی کتابیں ہیں، جو صحت وقوت اسناد کے لحاظ سے اس سے کہیں فائق ہیں، مگر ان کو وہ قبولیت حاصل نہیں جو ''سنن ابن ماجہ'' کو ملی جیسے ''صحیح ابن حبان''، جس کے متعلق مؤرخ ابن العماد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ:

''وأكثر النقاد على أن صحيحه أصح من ''سنن ابن ماجه'' لے.	اور اکثر ناقدین حدیث کا خیال ہے کہ ''صحیح ابن حبان'' ''سنن ابن ماجہ'' سے اصح ہے۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار | حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی کتابیں چار بتائی ہیں، حافظ مندہ نے بھی مخرجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد اور امام نسائی ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، بعد میں ابو طاہر سلفی نے ''جامع ترمذی'' کو بھی مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے ساتھ شمار کیا ہے، اور فرمایا کہ ان پانچوں کتابوں پر علماء مشرق ومغرب کا اتفاق ہے، شیخ ابن صلاح م۶۴۲ھ اور علامہ نووی م۶۷۶ھ تک نے ان ہی پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات بیان کی ہیں ۲، ان دونوں بزرگوں نے امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے علامہ سیوطی نے علامہ نووی پر ''تدریب الراوی'' میں استدراک کیا ہے کہ:

لم يدخل المصنف'' سنن ابن ماجه'' في الأصول، وقد اشتهر في عصر المصنف و بعده	مصنف (علامہ نووی) نے ''سنن ابن ماجہ'' کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا ہے حالاں کہ خود مصنف

لے شذرات (۱۶/۲) ترجمہ ابن حبان ۲ مقدمۂ ابن صلاح ص۳۸۷ و ماتمس إلیہ الحاجۃ ص۱۳۶

جعل الأصول ستة بإدخاله فيها" ۱؎.	کے عہد میں اوران کے بعد "سنن ابن ماجہ" کا چھ بنیادی کتابوں میں شمار مشہور ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ ہیں، جنہوں نے "سنن ابن ماجہ" کو "صحاح ستہ" میں داخل کیا، ان کے بعد تمام مصنفین نے ان کی پیروی کی ہے ۲؎، ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے "**الإكمال في أسماء الرجال**"، میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا کیا۔

اس کے بعد حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث رزین م ۵۲۵ھ نے کتاب "التجرید للصحاح والسنن" میں کتب خمسہ کے ساتھ "سنن ابن ماجہ" کے بجائے "موطأ امام مالک" کی حدیثوں کو درج کیا اور انہیں کی اقتداء علامہ ابن الأثیر جزری م ۶۲۶ھ نے "جامع الأصول" میں کی ہے، اس کے برخلاف علامہ ابوسعید خلیل بن کیکلدی العلائی م ۷۶۱ھ نے جو سب سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے "سنن دارمی" کو چھٹی کتاب قرار دیا ہے، شیخ محمد عابد سندی نے شیخ علائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

أنه قال: لو قدم "مسند الدارمي" بدل "ابن ماجه" فكان سادسا لكان أولىٰ ۳؎.	یعنی اگر "سنن ابن ماجہ" کے بجائے "سنن دارمی" کو چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔

حافظ ابن حجر نے بھی شیخ علائی کی ہمنوائی کی، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

۱؎ تدریب ج۱ ص۳۰ ۲؎ ماتمس إلیہ الحاجۃ ص۱۳۵

۳؎ مقدمۂ لامع الدراری ص۴۲

قال شيخ الإسلام: وليس أي ''الدارمي'' دون السنن الأربعة في الرتبة بل لوضم إلىٰ الخمسة فكان أولىٰ من ''ابن ماجه'' فإنه أمثل منه بكثير.

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے بلکہ اگر اس کو کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ''ابن ماجہ'' کی بہ نسبت یہ اُولیٰ ہے کیوں کہ وہ ''سنن ابن ماجہ'' سے کہیں فائق ہے[۱]۔

محدث عبدالغنی نابلسی نے اپنی کتاب ''ذخائر المواريث في الدلالة علىٰ مواضع الأحاديث'' میں لکھتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہے، پس اہل مشرق کے نزدیک ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ قزوینی کی کتاب، ''کتاب السنن'' ہے اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالکؒ بن انس کی ''موطأ'' ہے۔

لیکن علامہ سندی کا فیصلہ ہے کہ عام طور پر علماء متأخرین ''سنن ابن ماجہ'' کو حدیث کی چھٹی کتاب مانتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جہاں تک قوت وصحت کا تعلق ہے، ''موطأ'' کا مقام اس سے بہت بلند ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تو ''صحیحین'' پر اس کو ترجیح دی ہے ''سنن ابن ماجہ'' کو ''صحاح ستہ'' میں شمار کرنے کی وجہ اس کی افادیت ہے، اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو ''موطأ'' میں نہیں ہیں، علامہ تر ہتی فرماتے ہیں:

''وكتابه هذا لا يعد من الأصول ولا يلتحق بها، علىٰ

[۱] تدریب ج۱ ص۱۷۴

هذا أدرج أهل العلم بالأثر و المتقدمون منهم، و كثير من محققي المتأخرين، ولما رآه بعضهم كتاباً مفيداً قوي النفع في الفقه، ورأى من كثرة زوائدہٖ على "الموطأ" أدرجه علىٰ وهنه في الأصول" ۱؎.

اسی طرح ''مسند دارمی'' کی اہمیت جو بھی ہو لیکن ''صحاح ستہ'' کی جگہ مدت ہوئی ''سنن ابن ماجہ'' سے پُر ہو چکی ہے، مؤرخ ابن خلکان المتوفی ۶۰۱ھ امام ابن ماجہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں ۲؎۔

''وكتابه في الحديث أحد الصحاح الستة''.	حدیث میں ان کی کتاب ''صحاح ستہ'' میں ایک ہے۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں مرتبہ | امام ابو القاسم رافعی المتوفی ۶۲۳ھ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث امام ابن ماجہ کی کتاب کو ''صحیحین'' یا ''سنن أبی داود'' و ''سنن نسائی'' کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی روایات سے سند لاتے ہیں ۳؎۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''كلها جياد سوى اليسيرة'' ۴؎.	سب حدیثیں اچھی ہیں سوائے چند کے۔

علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''سنن ابن ماجہ'' بہت اچھی کتاب ہے، کاش اس میں چند واہی حدیثیں نہ ہوتیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے ۵؎۔

۱؎ الیانع الجنی بر حاشیہ کشف الأستار ص ۵۶ ۲؎ وفیات الأعیان ج ۱ ص ۵۴
۳؎ ما تمس إلیہ الحاجۃ ص ۱۳۳ ۴؎ البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۷ ۵؎ تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹

ابوزرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوعبداللہ ابن ماجہ کی کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں چند معمولی احادیث پر کلام ہے، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی [۱]، باقی کتاب میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔

مگر علامہ ذہبی نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس میں شاید تیس (۳۰) حدیثیں ایسی ہیں جن کی اسناد میں ضعف ہے [۲]، اس طرح امام ابوزرعہ کے دو قول ہو گئے، ایک دس (۱۰) کا دوسرا تیس (۳۰) کا۔

ممکن ہے ان تیس حدیثوں سے مراد وہ حدیثیں ہوں جن کو علامہ ابن الجوزی نے کتاب ''الموضوعات'' میں داخل کیا ہے، جس پر ''التعقبات علی الموضوعات'' میں تفصیلی بحث ہے، علامہ سیوطی نے ابوعبداللہ بن رشید کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابن ماجہ نے ایسے لوگوں کی حدیثوں کی تخریج کی ہے جو کذب سے متہم ہیں، ان کی بعض احادیث صرف ان ہی کے واسطے سے مروی ہیں، شارح ابن ماجہ اپنی شرح میں فرماتے ہیں:

''وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة في المرتبة''.

سنن ابن ماجہؒ کے متعلق ایک اہم غلط فہمی ''سنن ابن ماجہ'' کی ان ضعیف روایتوں کی وجہ سے یہ کلیہ مشہور ہو گیا ہے جیسا کہ حافظ مزی نے فرمایا: ''كل ما انفرد به ابن ماجه عن الخمسة فهو ضعيف'' [۳]، حافظ ابن حجر نے بھی تصریح کی ہے '' في ''السنن'' جامع جيد كثير الأبواب والغرائب، وفيه أحاديث ضعيفة جدا'' مگر حافظ ابن حجر نے اس کلیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے،

---

[۱] شروط الأئمہ ص ۱۶ [۲] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹ [۳] ماتمس إليه الحاجۃ ص ۱۳۵

"**وليس الأمر في ذلک علىٰ إطلاقه باستقرائي وفي الجملة ففيه أحاديث كثيرة منكرة**" [۱]، یعنی میرے استقراء کے مطابق یہ حکم علی الاِطلاق نہیں لگایا جاسکتا ہے، اگر چہ فی الجملہ اس میں منکراحادیث کی تعداد زیادہ ہے، اور مزی کی تصریح کو رجال پر محمول کرنا اولیٰ ہے، حدیثوں پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

جن روایات میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تحقیق میں رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اپنی "کتاب ابن ماجہ وعلم حدیث" میں اس کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر ابن ماجہ کا مرتبہ سب سے اخیر میں رکھا گیا ہے، علامہ ابوالحسن سندی شارح ابن ماجہ اپنی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "**وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة في المرتبة**" [۲]۔

تنبیہ | شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"ودریں کتب آنچہ اقسام حدیث است از صحاح وحسان وضعاف ہمہ موجود است وتسمیہ آں بصحاح بطریق تغلیب است" [۳]۔

ان کتابوں (صحاح ستہ) کی جتنی حدیثیں موجود ہیں، ان پر صحاح کا اطلاق **تغلیباً** کیا جاتا ہے، یہ واضح رہے کہ "صحاح ستہ" میں صحت کے لحاظ سے فرق مراتب مجموعی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ صحاح خمسہ کی ہر حدیث "سنن ابن

۱؎ تہذیب التہذیب ج۵ ص۳۴۰ ۲؎ ماتمس إلیہ الحاجۃ ص۱۴۲

۳؎ أشعۃ اللمعات ج۱ ص۱۱۵

ماجہ'' کی ہر روایت پر صحت میں فوقیت رکھتی ہے۔

تعداد ابواب واحادیث ''سنن ابن ماجہ'' میں بتیس کتابیں، پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں ہیں [۱]، جو چند کے سوا سب کی سب عمدہ ہیں [۲]۔

سلسلۂ روایت ابن ماجہ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے اور متعدد لوگوں نے اس کتاب کو امام صاحب سے روایت کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ جس کی روایت کو حسن قبول حاصل ہوا، وہ شیخ ابوالحسن قطان ہیں، ان کے نسخے میں بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں، مطبوعہ نسخوں میں ''قال ابوالحسن حدثنا'' سے یہی مراد ہیں، یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور محدث تھے ان کی ولادت ۲۵۴ھ اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی، ''سنن ابن ماجہ'' کی اہمیت کی بنا پر مختلف زمانے کے علماء نے اس کی جانب اعتناء کیا، اس کی شرحیں، حواشی اور دوسرے متعلقات پر کتابیں لکھیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شروح ومتعلقات **(۱) ''شرح ابن ماجہ''**: امام حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ الحنفی م ۷۶۲ھ نے سب سے پہلی شرح لکھی ہے جو جامعیت کے باوجود نامکمل رہ گئی، صرف ایک حصہ کی شرح پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۲) ''شرح ابن رجب حنبلی''، م ۷۹۵ھ۔

(۳) **''ماتمس إليه الحاجة على سنن ابن ماجه''، شيخ سراج الدين عمر بن علي الملقن م ۸۰٤ھ** یہ صرف زوائد یعنی ان روایات کی شرح ہے جو کتب خمسہ میں موجود نہیں ہیں۔

---

[۱] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۷۱، وبستان المحدثین ص ۱۲۵

(۴) ''الدیباجہ'': شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ، یہ شرح پانچ جلدوں میں ہے۔

(۵) ''**مصباح الزجاجه في زوائد ابن ماجه**''، از **شهاب احمد بن أبي بكر بوصيرى م ٨٤٠ھ**، انہوں نے احادیث پر کلام کر کے ان کا درجہ بھی بیان کیا ہے، مصر سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۶) ''نور مصباح الزجاجہ'': شیخ علی بن سلیمان مالکی مغربی، علامہ سیوطی کی شرح ''مصباح الزجاجہ شرح سنن ابن ماجہ'' کا اختصار کیا ہے، مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

(۷) ''شرح ابن ماجہ'': ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی حنفی المتوفی ۱۱۳۸ھ اس میں ضبط الفاظ، حل غریب اور بیان اعراب پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، شائع ہو چکی ہے۔

(۸) ''إنجاح الحاجہ شرح سنن ابن ماجہ'': شیخ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی م ۱۲۹۵ھ کی یہ ایک مختصر تعلیق ہے، شائع ہو چکی ہے۔

(۹) ''حاشیہ بر سنن ابن ماجہ'': مولانا فخر الحسن گنگوہی، یہ مشہور و متداول حاشیہ ہے، اس میں علامہ سیوطی اور مولانا عبدالغنی مجددی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کیا ہے۔

(۱۰) ''مفتاح الحاجہ''، شیخ محمد علی: یہ حاشیہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

(۱۱) ''**المجرد في أسماء رجال ابن ماجه كلهم سوى من أخرج منهم في أحد الصحيحين**'': از امام ذہبی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

(۱۲) ''ما تمس إليہ الحاجہ'' اور ''ابن ماجہ اور علم حدیث'': یہ دونوں کتابیں مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تصنیف ہیں، ان میں ''علم حدیث'' اور ''سنن ابن ماجہ'' پر تفصیلی گفتگو کی ہے، حدیث کے طالب علموں کے لیے ان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

امام طحاویؒ

امت نے جن محدثین کے مجموعوں کو ''صحاح ستہ'' کا درجہ دیا ہے، ان کے ہم عصر امام طحاویؒ بھی ہیں جو علم و تحقیق میں مجددانہ شان رکھتے ہیں، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ''وھو امام مجتھد ومجدد کما قال ابن الأثیر الجزري'' اس کا مطلب یہ ہے کہ شرح حدیث اور اس کے محامل وغوامض اور بحث وتحقیق کے لحاظ سے ان کو مجدد کہا گیا ہے، متقدمین اپنی کتابوں میں بحث وتحقیق کے بغیر روایات نقل کرتے چلے آتے ہیں، امام طحاویؒ نے بحث وتحقیق کی جدید راہ کھولی [۱]۔

ان کی کتاب ''شرح معانی الآثار'' اپنی خصوصیات وفوائد کے لحاظ سے ان تمام کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ محدثین عظام کی بزم میں امام طحاویؒ اور ان کے کارناموں کا مختصراً تعارف کرایا جائے۔

نام ونسب احمد نام، ابوجعفر کنیت، الأزدی الحجری المصری الطحاوی نسبت ہے، شجرۂ نسب یہ ہے:

ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ الأزدی الحجری المصری الطحاوی، جمہور محدثین ومؤرخین کا اس نسب نامے پر اتفاق ہے [۲]۔

---

[۱] معارف السنن ج ا ص ۱۱۵ [۲] تذکرہ الحفاظ ص ۲۹، ۳۰ ولسان المیزان ج ا ص ۱۷۵

امام موصوف کا تعلق چونکہ یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اس لئے اس کی طرف منسوب ہو کر ازدی وحجری کہلاتے ہیں [۱]، چونکہ امام صاحبؒ کے آباء واجداد فتح اسلام کے بعد مصر آ کر آباد ہو گئے تھے [۲]، اس لئے مصر کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے۔

طحاوی، ''طحا'' صعید مصر میں ایک گاؤں ہے جس کی طرف منسوب ہو کر طحاوی کہلاتے ہیں، اگرچہ صاحب ''**معجم البلدان**'' کی تحقیق یہ ہے کہ امام موصوف ''طحا'' کے باشندے نہیں تھے بلکہ اس کے قریب ہی ایک مختصر آبادی جو تقریباً دس مکانات پر مشتمل تھی جس کو ''طحطوط'' کہتے ہیں، اس کو امام صاحب کے وطن عزیز ہونے کا شرف حاصل ہے، مگر امام صاحب نے ''طحطوطی'' نسبت کو پسند نہ فرمایا، بلکہ اپنے وطن سے قریب آبادی ''طحا'' کی طرف نسبت کی [۳]۔

پیدائش اور وفات سن پیدائش میں قدرے اختلاف ہے، ۲۳۱ھ و ۲۲۹ھ بتایا گیا ہے، مگر مؤرخ ابن خلکان نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے [۴]، علامہ ذہبی نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، کیونکہ خود امام طحاوی سے یہی روایت ہے، سن وفات کے متعلق جمہور کی رائے ۳۲۱ھ ہے، تاریخ ولادت مصطفٰی (۲۲۹ھ)، مدتِ عمر محمد (۹۲)، اور تاریخ وفات محمد مصطفٰی (۳۲۱ھ)، قبر مبارک مصر میں امام شافعیؒ کے مزار کے پہلے واقع ہے۔

مصر ضروری معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ نے جس علم و دین کے گہوارے میں شعور کی

---

[۱] الجواہر المضیۂ ج ۱ ص ۱۰۲ [۲] الحاوی ص ۸ [۳] معجم البلدان ج ۶ ص ۳۰

[۴] وفیات الأعیان ج ۲ ص ۵۳ والفوائد السنیۃ ص ۳۸ والبدایہ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۱۷۴

آنکھیں کھولی تھیں، اس کی علمی و دینی مرکزیت کو بیان کیا جائے، مصر وہ سرزمین ہے جہاں تین سو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک قدم آئے، حافظ جلال الدین سیوطی نے "**در السحابة في من دخل مصر من الصحابة** ۱؎" میں ان سب کا تذکرہ لکھا ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ مصر کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فتح کیا تھا، صحابہ کرامؓ کی ایک خلقت یہاں آکر سکونت گزیں ہوئی، اور تابعین کے زمانہ میں یہاں علم کی کثرت رہی، پھر عمرو بن الحارث، یحییٰ بن ایوب، حیوہ بن شریح، لیث بن سعد، ابن لہیعہ کے دور میں اور زیادتی ہوئی جو ابن وہب، امام شافعی، ابن القاسم اور ان کے تلامذہ کے زمانے تک باقی رہی، اس کے بعد فرماتے ہیں:

"**و ما زال بها علم جمّ إلى أن ضعف ذلك باستيلاء العُبيديين الرافضة عليها سنة ثمان و خمسين و ثلاث مائة**".	اور وہاں برابر خوب علم رہا تا آنکہ ۳۵۸ھ میں عبیدی رافضیوں کے استیلاء کی بنا پر اس میں ضعف آگیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب جدید کی تدوین یہیں ہوئی ۲؎۔

حضرت نافع جو عبداللہ بن عمرؓ کے تلمیذ رشید ہیں اور تیس سال ان کی خدمت میں رہے ہیں، انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں معلم بنا کر مصر بھیجا تھا، اور لیث بن سعد یہیں کے رہنے والے تھے، جن کے متعلق امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

۱؎ اس رسالہ حسن المحاضرہ کے ساتھ اور مستقل بھی شائع ہو چکا ہے۔

۲؎ الإعلان بالتوبیخ للسخاوی ص ۱۳۹

''الليث أفقه من مالك إلا أنه ضيّعه أصحابه'' . | لیث، امام مالکؒ سے زیادہ افقہ تھے، پر ان کے شاگردوں نے انہیں ضائع کردیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں، ضائع کردینے سے امام شافعی کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مالکؒ وغیرہ کے تلامذہ نے ان کی فقہ کو مدوّن کیا، امام لیث کے شاگردوں نے نہیں کیا[۱]۔

چونکہ اکثر قضاۃ وہاں کے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر تھے، اس لئے فقہ حنفی کی بھی کافی شہرت تھی۔

تحصیل علم | امام موصوف علم کی طلب میں مصر آئے اور وہاں اپنے ماموں ابوابراہیم مزنی جو امام شافعیؒ کے اجلّ تلامذہ میں تھے، ان سے پڑھتے رہے، اس لئے ابتداءً امام شافعیؒ کے مقلّد تھے مگر چند سالوں کے بعد جب احمد بن ابوعمران حنفی مصر کے قاضی بن کر آئے تو ان کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے علم حاصل کیا، حتیٰ کہ ان کے علم وفضل سے متأثر ہوکر فقہ شافعی کے بجائے فقہ حنفی کے متبع ہوگئے[۲]، محمد بن احمد شروطی نے امام طحاوی سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کی کیوں مخالفت کی اور کیوں امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کو اختیار کیا؟ تو فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ ماموں ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کو مطالعے میں رکھتے تھے، پس اسی لئے میں بھی اس کی طرف منتقل ہوگیا[۳]۔

علامہ کوثری نے اس روایت کو بالتفصیل نقل کیا ہے کہ امام طحاوی نے اپنے

---

[۱] الرحمة الغيثية في الترجمة الليثية از حافظ ابن حجر ص۶

[۲] معجم البلدان ج۶ ص۳۰، والفوائد البہیہ ص۳۸ [۳] وفیات الأعیان ج۲ ص۵۳

ماموں مزنی کو دیکھ کر خود امام صاحبؒ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا، وہ فرماتے ہیں کہ ان کتابوں نے مجھے مذہب حنفی کا گرویدہ بنالیا، جس طرح میرے ماموں مزنی کو بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرف مائل کر دیا تھا، جیسا کہ ''مختصر مزنی'' سے ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل میں امام شافعیؒ سے اختلاف کیا ہے [1]، چونکہ یہ خود امام طحاویؒ کا اپنا بیان ہے، اس لئے یہی صحیح ومعتبر ہے، اس سلسلے میں جو بہت سے واقعات ''لسان المیزان'' وغیرہ میں نقل کئے گئے ہیں وہ سب بے سند وخلافِ درایت ہیں۔

سماع حدیث کے لئے سفر امام صاحبؒ نے امام مزنی کے علاوہ مصر کے دیگر محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فقہ وحدیث کو حاصل کیا، جن میں چند کے نام یہ ہیں: یونس بن عبدالأعلیٰ المتوفی ۲۶۴ھ جن کے متعلق ذہبی کے شاندار الفاظ یہ ہیں: ''**عالم الديار المصرية الإمام الحافظ المقرئ**'' اور ہارون بن سعید أیلی، محمد بن عبداللہ بن الحکیم، بحر بن نصر، عیسیٰ بن ابراہیم بن مثرود، ان کے علاوہ ابن عیینہ اور ابن وہب کے تلامذہ اور اس طبقہ کے دیگر مشائخ سے استفادہ کیا، اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۶۸ھ میں ملک شام کا رُخ کیا، جہاں ابوحازم قاضی دمشق سے ملاقات کی اور ان سے فقہ حاصل کی، اس کے بعد ۲۶۹ھ میں مصر واپس تشریف لائے [2]۔

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ جو شخص امام طحاوی کے شیوخ کے تراجم پر نظر ڈالے گا تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے شیوخ میں مصری، مغاربہ، یمنی، بصری، کوفی، حجازی، شامی وخراسانی مختلف ممالک کے حضرات نظر آئیں گے جن سے امام موصوف نے اخبار وآثار کا علم حاصل کیا، مصر اور اس کے علاوہ دیگر شہروں کے

---

[1] الحاوی ص ۱۶ [2] لسان المیزان ج ۱ ص ۳۰۰

شیوخ سے تحصیل علم کے لئے بادیہ پیمائی کی، یہی نہیں بلکہ مصر میں ہر وارد ہونے والے محدث و عالم کی خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے، یہاں تک کہ وہ علوم جو مختلف اشخاص کے پاس پراگندہ تھے،ان سب کوامام موصوف نے سمیٹ لیا[۱]۔

شیوخ واساتذہ ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے،ان کے ناموں پرنظرڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس دور کے ہر خرمنِ حدیث سے خوشہ چینی کی جن میں امام بخاریؒ وامام مسلمؒ کے شیوخ بھی ہیں، کیونکہ امام بخاریؒ کا سنِ وفات ۲۵۶ھ ہے، اس وقت امام طحاوی ۲۷ سال کے تھے،اسی طرح امام مسلمؒ نے ۲۶۱ھ میں وفات پائی جب کہ امام طحاوی ۳۲ سال کے تھے [۲]، امام طحاوی بواسطہ امام مزنی ،امام شافعیؒ کے شاگرد تھےاوران دو کے واسطے سے امام مالکؒ وامام محمدؒ کےاور تینوں کے واسطے سے امام اعظمؒ کے تلمیذ ہیں [۳]،وہ ایسے مشائخ سے بھی روایت کرتے ہیں جن میں دیگر اصحاب صحاح شریک ہیں،ان کی تعداد ۳۶ ہے،تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو''مقدمۂ أماني الأحبار''۔

تلامذہ ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبانِ حدیث وفقہ کا مرجع بنادیا تھا، اس لئے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے،ان کی ایک مختصر فہرست پیش ہے: احمد بن قاسم خشاب، ابوالحسن محمد بن احمد اِخمیمی ، یوسف بن قاسم میانجی، ابوبکر محمد بن ابراہیم المقرئ،طبرانی ، احمد بن عبدالوارث زجاج،عبدالعزیز بن محمد جوہری، قاضی صعید،محمد بن أبي بکر بن مطروح اوران کےعلاوہ دیگر حضرات ہیں [۴]۔

۱؎ الحاوی فی سیرۃ الإمام الطحاوی ص۹ ۲؎ الحاوی ص۹

۳؎ معارف السنن ج۱ص۱۱۴ ۴؎ لسان المیزان ج۲ص۲۷۵، وبستان المحدثین ص۹۶

علمی مرتبہ حفظ حدیث کے ساتھ وہ فقہ واجتہاد میں بہت بلند مقام رکھتے تھے، ملا علی قاریؒ نے ان کو طبقۂ ثالثہ کے مجتہدین میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مجتہدین ہیں جو ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی روایت منقول نہ ہو جیسے خصاف، ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الأئمہ سرخسی، فخر الاسلام بزدوی، فخر الدین قاضی خاں اور ان جیسے حضرات ہیں، یہ لوگ امام صاحبؒ سے اصول وفروع میں مخالفت نہیں کرتے، البتہ حسب اصول وقواعد ان مسائل میں احکام کا استنباط کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی نص نہ ہو [1]۔

مگر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''مختصر طحاوی'' دلالت کرتی ہے کہ امام طحاوی مجتہد منتسب تھے، محض امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ بہت سے مسائل میں ان کے مذہب سے اختلاف کیا ہے [2]، اس لئے مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کے طبقے میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ ان دونوں سے کم نہیں تھا [3]۔

فن جرح وتعدیل اور امام طحاویؒ فن رجال وجرح وتعدیل میں امام طحاویؒ کو کامل دستگاہ حاصل تھی، اس فن میں مستقل کتابیں بھی لکھی تھیں، ''تاریخ کبیر'' اور ''نقض المدلسین''، جو کرابیسی کے رد میں ہے، اسی طرح ابوعبید کی کتاب ''النسب'' پر مستقل تردید لکھی ہے، ان کے تلامذہ میں بھی ابن یونس، طبرانی اور ابن عدی جیسے ائمۂ جرح وتعدیل گزرے ہیں، مگر افسوس ان کی کتابیں آج ناپید ہیں، اب ''مشکل الآثار'' میں جہاں رواۃ پر اور ''معانی الآثار'' میں جہاں احادیث متعارضہ پر کلام

---

[1] مقدمہ أماني الأحبار ص ۵۹ بحوالۂ ذیل الجواہر المضیۃ [2] بستان ص ۹۶ [3] التعلیقات السنیہ ص ۳۸

کرتے ہیں، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے،البتہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتابیں اس فن پر موجود ومطبوع ہیں،مگر انہوں نے امام طحاویؒ کا ذکر نہ ان کے جلیل القدر شیوخ کے حالات میں کیا اور نہ ہی اعلیٰ درجہ کے تلامذہ میں درج کیا ہے،البتہ ''لسان المیز ان'' و''تہذیب'' میں بوقت ضرورت جرح وتعدیل میں امام طحاویؒ کا قول نقل کر دیا ہے، رجال حنفیہ کے متعلق اس طرز عمل کا شکوہ ان کے شاگرد حافظ سخاویؒ نے بھی کیا ہے، حافظ صاحبؒ کے متعلق جو شکایت امام سخاوی کو ہے اسی طرح علامہ سبکی شافعی کو علامہ ذہبی سے ہے۔

قاضی ابن شحنہ ''شرح ہدایہ'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:''حتی قال السبكي: إنه لا ينبغي أن يوخذ من كلامه ترجمة شافعي و لا حنفي ، و كذا لا ينبغي أن يؤخذ من كلام ابن حجر ترجمة حنفي متقدم و لا متأخر ''[1]، یہاں تک کہ علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ (ذہبیؒ) کے کلام سے کسی شافعی و حنفی کا ترجمہ لینا بھی مناسب نہیں، قاضی ابن شحنہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح حافظ ابن حجر کے کلام سے کسی متقدم ومتأخر حنفی کا ترجمہ لینا بھی مناسب نہیں ہوسکتا۔

امام طحاویؒ کے کمالات کا اعتراف امام صاحب کے فضل وکمال، ثقاہت و دیانت کا اعتراف ہر دور کے محدثین ومؤرخین نے کیا ہے، جیسے متقدمین میں طبرانی، ابو بکر خطیب، حمیدی، ابن عساکر وغیرہ اور متأخرین میں ابی الحجاج مزّی، حافظ ذہبی، علامہ ابن کثیر وغیرہ ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امام طحاویؒ قرآن وحدیث سے استنباط وفقہ میں اپنے معاصرین ومابعد کے علماء میں نظیر نہیں رکھتے، انہیں ''أعلم الناس بمذهب الإمام

---

[1] ماتمس بالیہ الحاجۃ ص ۴۷

أبي حنيفة" کہا گیا ہے ۱؎۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں:

"کان الطحاوي من أعلم الناس بسِيَر الكوفيين و أخبارهم و فقههم مع مشاركته فی جميع مذاهب الفقهاء" ۲؎.	امام طحاوی کوفیین کے سیر واخبار وفقہ کے بڑے عالم تو تھے ہی، ساتھ ہی دیگر مذاہب سے بھی واقف تھے۔

ابن حماد حنبلی نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے: " شيخ الحنفية، الثقة الثبت، برع في الحديث و الفقه" ۳؎.

ابن تغري نے" أحد الأعلام و شيخ الإسلام " کا خطاب دیا، فرماتے ہیں کہ امام طحاوی تو فقہ وحدیث واختلاف علماء واحکام ولغت ونحو وغیرہ علوم میں نظیر نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے بہترین کتابیں تصنیف کیں ۴؎۔

علامہ ابن جوزی نے یہ شاندار الفاظ استعمال کئے ہیں: "كان ثبتا فهما فقيهاً عاقلاً" ۵؎.

امام طحاوی کے ناقدین امام طحاوی کی جلالتِ شان وثقاہت کے باوجود بعض متأخرین علماء نے اعتراضات کئے ہیں جو متقدمین کے اعتراف وتوثیق کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہؒ نے" منہاج السنۃ" میں

۱؎ معارف السنن ج ۱ ص ۱۱۴ ۲؎ لسان المیز ان ج ۱ ص ۲۷۵
۳؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۸ ۴؎ النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۲۳۹ ۵؎ المنتظم ج ۶ ص ۲۵۰

حدیثِ ردِشمس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ امام طحاوی کے نقد حدیث کا معیار اہل علم سے مختلف تھا، ''شرح معانی الآثار'' میں احادیث مختلفہ کو بیان کیا ہے اوران میں اس کو راجح قرار دیا جس کو ازروئے قیاس حجت سمجھا ہے، ان کو دوسرے اہل علم کی طرح اسناد کی معرفت حاصل نہیں تھی، اگرچہ کثیر الحدیث وفقیہ اور عالم ہیں [۱]، ان کو علامہ ابن جوزیؒ کے کلام سے دھوکہ ہوا کیونکہ انہوں نے موضوع کہا ہے اوران کا تشدد اس باب میں مشہور ہے، اس حدیث کی تصحیح بہت سے علماء نے کی ہے، حافظ أبوالفتح ازدی نے صحیح قرار دیا، اور ابوزرعہ وابن العراقی نے حسن کہا، حافظ ابن حجر نے ابن جوزی کی خطا قرار دیا، یہ حدیث تعدد طرق سے مروی ہے، اس لئے امام طحاوی وخفاجی نے صحیح قرار دیا [۲]، علامہ سیوطی نے بھی ''اللآلي المصنوعۃ'' میں اس کو صحیح بتایا ہے [۳]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مسلمہ بن قاسم اندلسی کے اعتراض کو'' لسان المیزان'' میں نقل کیا ہے، حالانکہ مسلمہ نے اسی طرح کا اعتراض جب امام بخاری پر کیا تو ''تہذیب التہذیب'' میں اس کی تردید کی ہے اور مسلمہ کو مجہول قرار دیا ہے۔

تصانیف | مؤرخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ نے مختلف فنون پر تصانیف کی ہیں، متأخرین علماء سے زیادہ متقدمین نے ہمیشہ اسے قدر کی نظر سے دیکھا ہے، افسوس اس میں اکثر غیر مطبوع ہیں، اس کی فہرست پیش ہے:

(۱) ''معانی الآثار'': اس کا تفصیلی تعارف آئندہ کے صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

---

[۱] منہاج السنۃ ج۴ص۱۹۴ [۲] المقاصد الحسنہ ص۱۰۷

[۳] اللآلی المصنوعۃ ج۱ص۳۳۷ وشرح الشفاء ج۳ص۱۷، ۱۸، وظفر الأمانی ص۴۶۱

(۲) ''مشکل الآثار'': ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ یہ آخری تصنیف ہے [۱]، اس میں مصنف نے احادیث کے تضاد کو رفع کیا ہے، اوران سے احکام کا استخراج کیا ہے، حیدر آباد سے جو چار جلدیں طبع ہوئی ہیں، وہ غالبًا پوری کتاب کے نصف سے بھی کم ہے [۲]، قاضی ابن رشد نے بعض اعتراضات کے ساتھ اس کا اختصار کیا ہے، علامہ عینی کے شیخ قاضی جمال الدین یوسف بن موسیٰ ملطي نے اس اختصار کا بھی اختصار کیا ہے جو ''المعتصر من المختصر'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

(۳) ''اختلاف العلماء'': ۳۰ جزء حدیثی میں بیان کی جاتی ہے، یہ پانچ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

(۴) ''کتاب احکام القرآن'': ۲۰ جزء میں ہے۔

(۵) ''کتاب الشروط الکبیر'': ۴۰ جزء میں ہے۔

(۶) ''کتاب الشروط الأوسط''۔ (۷) ''کتاب الشروط الصغیر''۔

(۸) ''مختصر الطحاوي'': حیدر آباد سے چھپ کر مشہور ومتداول ہو چکی ہے۔

(۹) ''نقض کتاب المدلسین'': ۵ جزء میں کرابیسی کی ''کتاب المدلسین'' کا بہترین رد ہے۔

(۱۰) ''الرد علی أبي عبید''۔ (۱۱) ''التاریخ الکبیر''۔

(۱۲) ''کتاب فی النحل وأحکامها''۔

(۱۳) ''عقیدۃ الطحاوي'': مطبوع ہو چکی ہے۔

(۱۴) ''سنن الشافعي'': اس میں وہ سب حدیثیں جمع کر دی ہیں جو امام مزنی کے واسطے

---

[۱] الفوائد البہیہ ص ۳۸ [۲] پوری کتاب ۱۶؍جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

سے امام شافعیؒ سے سنی تھیں۔

علامہ عینی نے کہا ہے کہ (مسند شافعیؒ) کو روایت کرنے والے اکثر امام طحاوی کے واسطہ سے ہیں، اس لئے "سنن شافعی" کو "سنن طحاوی" بھی کہا گیا ہے۔

(۱۵) "شرح المغنی"۔ (۱۶) "النوادر الفقہیہ": ۱۰ اجزء میں ہے۔

(۱۷) "النوادر والحکایات": تقریباً ۲۰ جزء میں ہے۔

(۱۸) "جزء فی حکم أرض مکۃ"۔ (۱۹) "جزء فی قسم الفیٔ والغنائم"۔

(۲۰) "کتاب الأشربۃ"۔ (۲۱) "الرد علی عیسیٰ بن أبان"۔

(۲۲) "جزء فی الرزیۃ"۔ (۲۳) "شرح الجامع الصغیر" للامام محمد۔

(۲۴) "شرح الجامع الکبیر" لہ۔ (۲۵) کتاب "المحاضر والسجلات"۔

(۲۶) کتاب "الوصایا"۔ (۲۷) کتاب "الفرائض"۔

(۲۸) "أخبار أبي حنیفہ وأصحابہ"۔

(۲۹) "کتاب التسویۃ بین (حدثنا) و(أخبرنا) طبع ہو چکی ہے۔

(۳۰) "کتاب صحیح الآثار"۔

(۳۱) "اختلاف الروایات علیٰ مذہب الکوفیین"۔

(۳۲) "کتاب العزل"۔ (۳۳) "مناقب أبي حنیفۃ"۔

شرح معانی الآثار "شرح معانی الآثار" کو "معانی الآثار" بھی کہا گیا ہے، ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ امام صاحب کی پہلی تصنیف ہے [۱]، مگر ان کی کتابوں میں نہایت اہم و مشہور و متداول ہے، علماء نے خصوصیت سے اس کی طرف اعتناء کیا ہے،

---

[۱] الفوائد البہیہ ص ۳۸

حافظ سخاوی نے جن کتبِ حدیث کے مطالعے کا خصوصی مشورہ دیا ہے اس میں ''شرح معانی الآ ثار'' بھی ہے۔

علامہ امیر اِتقانی فرماتے ہیں:

''فانظر "شرح معاني الآثار" هل ترى له نظيراً في سائر المذاهب فضلا عن مذهبنا هذا'' ۱؎.	''شرح معانی الآ ثار'' پرغور کرو، کیا تم ہمارے اس مذہب حنفی کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی نظیر پا سکتے ہو؟

علامہ عینی نے برسوں اس کا درس دیا ہے۔

معانی الآ ثار کا کتب حدیث میں مقام | علامہ عینیؒ نے اس کو دوسری بہت سی کتب حدیث پر ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں کہ ''سنن أبي داود'' و''جامع ترمذی'' و''سنن ابن ماجہ'' وغیرہ پر اس کی ترجیح اس قدر واضح ہے کہ اس میں شک کوئی ناواقف ہی کرے گا ۲؎۔

علامہ ابن حزم نے اپنے جمود وتشدد کے باوجود اس کو''سنن أبي داود'' و''سنن نسائی'' کے درجہ پر رکھا ہے ۳؎، علامہ ابن خلدون، امام دارقطنی وغیرہ کی تقلید میں یہ لکھ گئے کہ طحاوی کے شرائط متفق علیہ نہیں ہیں، کیونکہ مستور الحال وغیرہ سے بھی روایت کی ہے، اس لئے اس کا مرتبہ ''صحیحین'' و''سنن'' کے بعد ہے ۴؎، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک امام طحاوی کی کتاب ''شرح معانی الآ ثار'' کا

۱؎ الفوائد البہیہ ص ۱۸ ۲؎ الحاوی ص ۱۲
۳؎ مقدمۂ التعلیق الممجد ج ۱ ص ۷۶ ۴؎ الحطہ ص ۳۴

مرتبہ ''سنن ابی داود'' کے قریب ہے کیونکہ اس کے رواۃ معروف ہیں، اگر چہ بعض متکلم فیہ بھی ہیں، اس کے بعد ''ترمذی''، پھر ''سنن ابن ماجہ'' کا درجہ ہے[۱]۔

معانی الآ ثار پر امام بیہقی کے اعتراض کا جواب امام بیہقی نے امام طحاوی اور ان کی کتاب ''معانی الآ ثار'' پر اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ علم حدیث امام طحاوی کا فن نہیں تھا، بلکہ انہوں نے کچھ حاصل کر لیا تھا، مگر انھیں اس میں رسوخ و اتقان حاصل نہیں، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ''شرح معانی الآ ثار'' میں انھوں نے بہت سی ضعیف حدیثوں کو اپنی رائے سے صحیح کہہ دیا اور بہت سی صحیح کو ضعیف کہہ دیا۔

شیخ عبدالقادر نے ''الجواہر المضیئۃ'' [۲] میں اس پورے اعتراض کو نقل کر کے جواب دیا ہے کہ میں نے امام طحاوی کی کتاب کی شرح لکھی ہے اور اس کی اسانید پر کلام بھی کیا ہے، ''صحاح ستۃ''، ''مصنف أبي بکر بن أبي شیبۃ'' اور دوسری کتب حدیث سے مطابقت کر کے پرکھا بھی ہے، مگر حاشا وکلاّ! امام بیہقی نے جو اعتراض کیا ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے، اس شرح کا نام ''الحاوی فی بیان آ ثار الطحاوی'' رکھا ہے، امام بیہقی کے جواب میں قاضی القضاۃ علاء الدین ماردینی نے ''**الجوهر النقي في الرد على البيهقي**'' لکھی ہے، جس میں تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جو اعتراض امام طحاوی پر کر رہے ہیں، اس کے مرتکب وہ خود ہیں، ''**الجوهر النقي**''، ''سنن بیہقی'' کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ جس طرح کے اعتراضات ''معانی الآ ثار'' پر کئے گئے ہیں اس طرح کے بلکہ اس سے زیادہ سخت اعتراضات تو ''سنن اربعۃ'' پر کئے گئے ہیں، اور

---

[۱] فیض الباری ج ۱ ص ۵۷، ۵۸ [۲] الجواہر المضیئۃ ج ۴ ص ۵۷۰

یہ کتاب ''سنن بیہقی''، ''سنن دارمی''اور ''سنن دارقطنی'' سے بدرجہا فائق ہے[1]۔

معانی الآثار کی خصوصیات | اب ہم چند کتابی خصوصیات کی طرف اشارہ کررہے ہیں تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ''مقدمۂ أمانی الأحبار''۔

(۱) اس میں بکثرت ایسی حدیثیں موجود ہیں جس سے دیگر کتب خالی ہیں۔

(۲) ایک حدیث کی مختلف اسانید جمع کردیتے ہیں، جس سے ایک محدث کو بہت سے نکات وفوائد کا علم ہوتا ہے۔

(۳) غیر منسوب رواۃ کی نسبت اور مبہم راوی کا نام، مشتبہ کی تمیز، مجمل کی تفسیر، اضطراب وشک راوی سب کو نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

(۴) صحابہؓ وتابعین کے آثار، فقہاء کے اقوال اور ائمہ کی جرح وتعدیل بھی بیان کرتے ہیں، جس سے ان کے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔

(۵) کبھی ترجمۃ الباب کسی فقہی مسئلہ پر قائم کرتے ہیں اور باب کے تحت کی روایت سے ایسے دقیق استنباطات کرتے ہیں جس کی طرف اذہان کم منتقل ہو سکتے تھے۔

(۶) کتاب کو فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ باب کے تحت کی روایت بظاہر ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی مگر نہایت لطیف طریقے سے ترجمہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے اس کی روایت کرتے ہیں مثلاً ''باب المیاہ'' کے تحت ''**إن المسلم لا ینجس**'' أعرابی کے مسجد میں بول والی حدیث ذکر کی ہے، یہ مقامات نہایت دقیق ہیں۔

---

[1] الفوائد البہیۃ ص۳۱ وماتمس إلیہ الحاجۃ ص۱۱۳

(۷) أدلۂ أحناف کے ساتھ دوسرے أئمہ کے دلائل بھی بیان کرتے ہیں، اوراس پرنظر قائم کرکے پوری طرح محاکمہ کرتے ہیں جس سے تفقہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

شروح ومتعلقات (۱)''الحاوي في تخريج معاني الآثار للطحاوي'' (للحافظ عبدالقادر القرشي).

(۲) ''مباني الأخبار'' للعيني، چھ جلدوں میں موجود ہے جس میں رجال پر کلام نہیں کیا ہے، مخطوطہ ہے۔

(۳) ''نخب الأفكار في شرح معاني الآثار'' للعيني عینی نے شرح حدیث کے ذیل میں رجال پر بھی مفصل گفتگو کی ہے، یہ''عمدۃ القاری'' شرح بخاری کے مثل ہے، یہ کتاب ۱۸/جلدوں میں دارالنوادر دمشق سے شائع ہوچکی ہے۔

(۴) ''معاني الأخبار في رجال معاني الآثار'' (للعینی) اس کی تلخیص ''كشف الأستار'' کے نام سے طبع ہوچکی ہے۔

ان کے علاوہ ابن عبدالبر اور علامہ زیلعی نے''معانی الآ ثار'' کی تلخیص کی ہے، محمد باہلی کی کتاب''تصحیح معانی الآ ثار'' کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

حافظ قاسم بن قطلو بغا نے بھی طحاوی کے رجال پر ایک مستقل تصنیف ''الإيثار في رجال معاني الآثار'' کے نام سے کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی''إتحاف المهرة'' میں جن دس کتابوں کے اطراف جمع کئے ہیں، ان میں''معاني الآثار للطحاوي'' بھی شامل ہے۔

''أماني الأحبار في شرح معاني الآثار''، حضرت مولانا محدث

الداعی الی دین اللہ و إلی دار السلام محمد یوسف نور اللہ مرقدہ کی گرانقدر ومعرکۃ الآراء شرح ہے، فی الواقع یہ تمام شروح سابقہ کا بہترین خلاصہ ہے، اس کتاب میں حضرت مولانا کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ اکثر متقدمین (حافظ وعینی کے پیشرو) علماء کے اقوال نقل کئے جائیں، جب متقدمین کا کوئی قول نہیں ملتا تو متأخرین کے اقوال علی الترتیب نقل کئے ہیں، اس شرح میں طحاوی کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ شرح کی تکمیل نہ ہوسکی، لیکن حضرت مولانا کی زندگی میں صرف دو ہی جلدیں چھپ کر شائع ہوسکیں کہ اچانک حضرت نور اللہ مرقدہ کا سانحۂ وصال پیش آیا ؎

نہ سمجھے تھے کہ اس جہانِ جہاں سے یوں جدا ہوں گے
یہ سنتے گو چلے آتے تھے اِک دِن جان جانی ہے

تیسری جلد بعد میں شائع کی گئی ہے، اس کے بعد چوتھی جلد شائع کی گئی، کتاب "**باب الرکعتین بعد العصر**" تک پہونچ سکی، پہلی جلد کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، اس مقالہ میں اس سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے۔

"الامام الطحاوی المحدث" کے عنوان پر اس ناچیز کا بہت اہم مقالہ ہے جو طبع بھی ہو چکا ہے۔

(وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين).

کتاب کے اہم مصادر ومراجع کی اجمالی فہرست

نمبر شمار	موضوع
۱	اِتحاف النبلاء المتقین، نواب صدیق حسن خاں
۲	الأدب المفرد، امام بخاریؒ
۳	الإحکام فی أصول الأحکام، حافظ ابن حزم
۴	أوجز المسالک فی شرح موطأ مالک، مولانا محمد زکریاؒ
۵	الإنصاف فی سبب الاختلاف، شاہ ولی اللہؒ
۶	أبجد العلوم، نواب صدیق حسن خاں
۷	إعلام الموقعین، حافظ ابن قیمؒ
۸	اختصار علوم الحدیث، حافظ ابن کثیرؒ
۹	القول المسدّد فی الذب عن المسند، حافظ ابن حجرؒ
۱۰	أقوم المسالک، محدث محمد زاہد کوثری
۱۱	الانتقاء حافظ ابن عبد البر مالکی
۱۲	أمانی الأحبار، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ
۱۳	أشعۃ اللمعات، شیخ عبد الحق محدث دہلوی
۱۴	الإصابہ فی معرفۃ الصحابہ، حافظ ابن حجرؒ

نمبر شمار	موضوع
۱۵	الإکمال فی أسماء الرجال، شیخ ولی الدین خطیب
۱٦	الإعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، حافظ سخاوی
۱۷	البدایہ والنہایہ، حافظ ابن کثیرؒ
۱۸	بستان المحدثین، شاہ عبدالعزیزؒ
۱۹	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، علامہ کاسانی
۲۰	بذل المجہود فی حل أبی داود، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
۲۱	الباعث الحثیث، حافظ ابن کثیرؒ
۲۲	بلوغ الأمانی، محدث کوثری
۲۳	تدریب الراوی، حافظ سیوطی
۲۴	تذکرۃ الحفاظ، حافظ ذہبی
۲۵	تہذیب التہذیب، حافظ ابن حجرؒ
۲٦	التعقبات علی الموضوعات، حافظ سیوطی
۲۷	تحفۃ الأحوذی شرح ترمذی، عبدالرحمٰن مبارکپوری
۲۸	تزئین الممالک بمناقب إمام مالک، حافظ سیوطی
۲۹	تہذیب سنن أبی داود، حافظ ابن قیمؒ
۳۰	التلخیص الحبیر، حافظ ابن حجرؒ
۳۱	تفسیر ابن جریر، طبری

نمبر شمار	موضوع
۳۲	تدوین حدیث، مولانا مناظر احسن گیلانی
۳۳	توجیہ النظر، شیخ طاہر جزائری
۳۴	تلقیح فہوم اہل الأثر، حافظ ابن جوزیؒ
۳۵	التعلیق الممجد ،مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلیؒ
۳۶	توالی التأسیس، حافظ ابن حجرؒ
۳۷	تأنیب الخطیب، محدث کوثری
۳۸	تقریب التہذیب، حافظ ابن حجرؒ
۳۹	الإتقان فی علوم القرآن، حافظ سیوطیؒ
۴۰	تاریخ الإسلام، حافظ ذہبیؒ
۴۱	توضیح الأفکار، امیر یمانی
۴۲	تہذیب الکمال، حافظ مزی
۴۳	تہذیب الأسماء واللغات، امام نوویؒ
۴۴	تنویر الحوالک، علامہ جلال الدین سیوطیؒ
۴۵	تعجیل المنفعہ ،حافظ ابن حجرؒ
۴۶	التعلیقات السنیۃ، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ
۴۷	ترتیب المدارک، مدارک، قاضی عیاض
۴۸	تاریخ بغداد، خطیب بغدادی

موضوع	نمبر شمار
تبییض الصحیفہ ،حافظ سیوطی	۴۹
تقیید العلم للخطیب البغدادی	۵۰
جامع بیان العلم،حافظ ابن عبدالبر مالکی	۵۱
جامع الاصول،علامہ ابن الأثیر جزری	۵۲
الجواہر النقی فی الرد علی البیہقی ،علاء الدین ماروینی	۵۳
الجواہر المضیئۃ ،حافظ عبدالقادر قرشی	۵۴
حاشیہ السندی علی سنن النسائی	۵۵
حجۃ اللہ البالغہ،شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۵۶
الجامع الصحیح للإمام البخاری	۵۷
حسن التقاضی،محدث کوثری	۵۸
حسن المحاضرہ،حافظ سیوطی	۵۹
الحطہ بذکر الصحاح الستۃ ،نواب صدیق حسن خاں	۶۰
حلیۃ الأولیاء،حافظ ابونعیم أصبہانی	۶۱
الحاوی فی سیرۃ الإمام الطحاوی،محدث کوثری	۶۲
الخیرات الحسان،حافظ ابن حجر مکی	۶۳
الدرر المنیفہ فی أدلۃ مذہب الإمام أبی حنیفہؒ،علامہ مرتضیٰ زبیدی	۶۴
الرحمۃ الغیثیہ ،حافظ ابن حجرؒ	۶۵
الرسالہ،امام شافعیؒ	۶۶

نمبر شمار	موضوع
٦٧	زہر الربیٰ علی المجتبیٰ، علامہ سیوطیؒ
٦٨	ظفر الأمانی، مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ
٦٩	عجالۂ نافعہ، شاہ عبد العزیز دہلویؒ
۷۰	عقود الجمان فی مناقب أبی حنیفۃ النعمان، حافظ محمد بن یوسف دمشقی
۷۱	عون المعبود شرح أبی داود
۷۲	عمدۃ القاری شرح بخاری، علامہ عینیؒ
۷۳	غایۃ المقصود فی حل أبی داود، شمس الحق عظیم آبادی
۷۴	غایۃ المقصود فی زوائد المسند، حافظ نور الدین ہیثمی
۷۵	فتح الباری، حافظ ابن حجرؒ
۷٦	فتح المغیث، حافظ سخاویؒ
۷۷	فیض الباری، مولانا انور شاہ کشمیریؒ
۷۸	فتح الملہم، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۷۹	الفوائد البہیۃ، مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ
۸۰	الفہرست، لابن الندیم
۸۱	فتح القدیر، شیخ ابن ہمام
۸۲	قرۃ العینین، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
۸۳	القاموس المحیط، علامہ مجد الدین فیروز آبادی
۸۴	منتخب کنز العمال، شیخ علی متقی

نمبر شمار	موضوع
۸۵	الکوکب الدری، اَمالی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۸۶	کتاب العلل، امام ترمذیؒ
۸۷	کتاب الاستغاثہ، حافظ ابن تیمیہؒ
۸۸	کشف الظنون، ملا کاتب چلپی
۸۹	الکفایہ، خطیب بغدادی
۹۰	کلمات طیبات، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
۹۱	لامع الدراری، مولانا محمد زکریا صاحبؒ
۹۲	لسان المیزان، حافظ ابن حجرؒ
۹۳	الموافقات، اِمام شاطبیؒ
۹۴	المستدرک، اِمام حاکم
۹۵	الملل والنحل، ابن حزم ظاہری
۹۵	مناقب مالک، اِمام رازی
۹۷	مصفیٰ (فارسی) شاہ ولی اللہؒ
۹۸	مسند اَحمد، اِمام اَحمدؒ
۹۹	منیۃ الألمعی، قاسم بن قطلوبغا
۱۰۰	منہاج السنۃ، حافظ ابن تیمیہؒ
۱۰۱	معارف السنن، مولانا محمد یوسف بنوریؒ
۱۰۲	میزن الاعتدال، علامہ ذہبی

موضوع	نمبر شمار
مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ملا علی قاریؒ	۱۰۳
ماتمس إلیہ الحاجۃ، مولانا عبدالرشید نعمانیؒ	۱۰۴
المقاصد الحسنۃ، حافظ سخاویؒ	۱۰۵
معجم البلدان، یاقوت حموی	۱۰۶
مناقب للإمام الأعظم، صدر الأئمہ موفق بن أحمد مکی	۱۰۷
المیزان الکبریٰ، إمام عبدالوہاب شعرانی	۱۰۸
مقدمۂ ابن صلاح	۱۰۹
مسک الختام، نواب صدیق حسن خاں	۱۱۰
مجمع بحار الأنوار، شیخ طاہر پٹنی	۱۱۱
مفتاح السنۃ، اُستاد خولی	۱۱۲
المنتظم، علامہ ابن جوزی	۱۱۳
نصب الرایہ، علامہ زیلعی	۱۱۴
نیل الأوطار، قاضی شوکانی	۱۱۵
نیل الفرقدین، مولانا انور شاہ کشمیریؒ	۱۱۶
الوابل الصیب، حافظ ابن قیمؒ	۱۱۷
وفیات الأعیان، لابن خلکان	۱۱۸
الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبدالغنی	۱۱۹

صاحب کتاب

نام: ڈاکٹر تقی الدین الندوی بن بدرالدین بن محمد حسن

ولادت: ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۴ء

جائے ولادت: مظفر پور، اعظم گڈھ، یوپی

تعلیم:

مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، پی ایچ ڈی ۱۹۷۶ء جامعہ ازہر۔

تدریس ومناصب:

حدیث ومختلف اسلامی علوم کی تدریس، شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، فلاح دارین ترکیسر گجرات، قاضی مستشار علمی محکمۂ شرعیہ ابوظبی، از ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء استاذ و پروفیسر حدیث (عین یونیورسٹی) از ۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۵ء و مستشار دیوان ممثل رئیس دولۃ الإمارات۔

علوم اسلامیہ کی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۸ء میں صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ دیا گیا

رکن مجلس شوریٰ:

☆ ندوۃ العلماء لکھنؤ
☆ دار المصنفین اعظم گڈھ
☆ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور
☆ دار العلوم تاج المساجد بھوپال
☆ صدر محبّ الدین مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی منگراواں اعظم گڈھ

بانی وسرپرست:

جامعہ اسلامیہ، مظفر پور، اعظم گڈھ ورئیس مرکز الشیخ أبی الحسن الندوی مظفر پور، اعظم گڈھ

مصنف کی دیگر اہم کتابوں کی فہرست

۱۔ الامام البخاری (عربی) دمشق
۲۔ الامام ابوداود المحدث الفقیہ 〃
۳۔ الامام مالک ومکانۃ کتابہ الموطأ 〃 ابوظبی
۴۔ علم رجال الحدیث 〃 بیروت، القاہرہ
۵۔ کتاب الزہد الکبیر للامام البیہقی (تحقیق وتعلیق) 〃 کویت، ابوظبی
۶۔ أعلام المحدثین بالہند 〃 ابوظبی
۷۔ أعلام المحدثین ومآثرھم العلمیۃ 〃 بیروت
۸۔ دراسۃ الکتب السیرۃ القدیمۃ ومصادرہا الاولیٰ 〃 دوحہ، قطر
۹۔ تحقیق وتعلیق "بذل المجہود فی حل أبی داود" ۱۴ر جلدوں میں 〃 بیروت، ہند
۱۰۔ لمحۃ عن تعریف اہم مراجع السنۃ (عربی) ابوظبی
۱۱۔ تحقیق وتعلیق "التعلیق الممجد" از علامہ عبدالحی لکھنوی ۳ جلدوں میں بیروت
۱۲۔ تحقیق وتعلیق ظفر الأمانی فی شرح مختصر الجرجانی 〃 بیروت
۱۳۔ تحقیق وتعلیق "اوجز المسالک" حضرت شیخ الحدیثؒ ۱۸ جلدوں میں 〃 بیروت، ہند
۱۴۔ محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے (اردو، فارسی) لکھنؤ، کراچی، ایران
۱۵۔ فن اسماء الرجال (اردو) لکھنؤ
۱۶۔ صحبتے با اولیا (یعنی حضرت شیخ الحدیثؒ) اردو، انگریزی، گجراتی، بنگالی، فرانسیسی
۱۷۔ چاند کی تسخیر (اردو، انگریزی) گجرات
۱۸۔ اسباب زلزلہ (گجراتی زبان میں) گجرات
۱۹۔ مستشرقین اور علم حدیث معارف اعظم گڈھ
۲۰۔ الجامع الصحیح مع حاشیہ السہارنپوری مع مقارنہ عشر نسخ معتمدۃ ۱۵ر جلدوں میں

ان کے علاوہ دیگر مقالات ورسالے ہیں جن کا ذکر اختصار کے پیش نظر حذف کیا جارہا ہے۔